شہرِ بزرگ

گنگوہ شریف

1425ھ

تصنیف

محمد نسیم انور ایوبی گنگوہی

شہرِ بزرگ

گنگوہ شریف

1425ھ

تصنیف

محمد نسیم انور ایوبی گنگوہی

9213783786-م

شائع کردہ

ادارۂ تاریخ

(۱) ڈی — 67،68 گلی نمبر 2، منگل بازار روڈ،
سنگم وِہار، نئی دہلی 62

(۲) قاضی سلیم اختر ایوبی محمد غوری چوک، محلہ محمد غوری،
گنگوہ شریف، ضلع سہارنپور، یوپی

کتاب : شہر بزرگ گنگوہ شریف
مصنف : محمد نسیم انور ایوبی گنگوہی
سن اشاعت : 2004ء
تعداد : 500
قیمت : 150/روپے (۱۰۰/-)
کمپوزنگ : محمد اسلام خان، اوکھلا مین مارکیٹ، نئی دہلی، فون: 9868357106
سرورق : ڈاکٹر رشدی نسیم ایوبی
مطبع : بھارت آفسیٹ، دہلی-6
طابع وناشر : ڈاکٹر علیم افسر ایوبی، موبائل: 9810297672

ملنے کے پتے :

(۱) ایوبی کلینک، ڈاکٹر علیم افسر ایوبی، B-78، تگروی ایکسٹینشن، نئی دہلی-62
(۲) ایوبی کلینک، ڈاکٹر عظیم انور ایوبی، ایچ، 276- سوربھ وہار، جیت پور، نئی دہلی 9899847410
(۳) ایوبی کلینک، ڈاکٹر منور نعیم ایوبی، محمد غوری چوک، محلہ محمد غوری، گنگوہ شریف فون 232321
(۴) قرآن محل-2853، بلبلی خانہ، ترکمان گیٹ، دہلی-۶ فون 9811346520
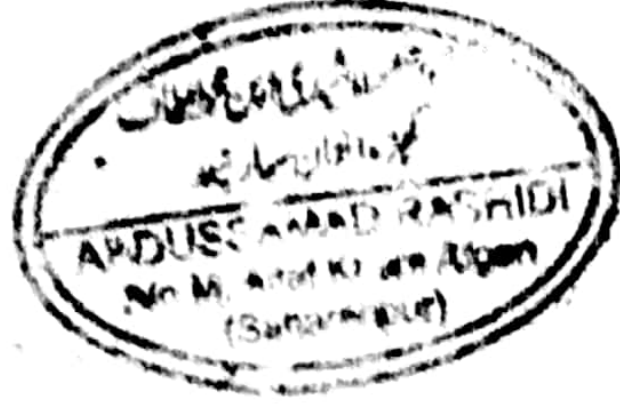
انتساب

برادرِ کلاں:

جناب قاضی محمد نعیمؒ ایوبی گنگوہی

کے نام

اعتراف

مجمل تاریخ گنگوہ 1425ھ کی تکمیل میں ماشاء اللہ میرے بچے سلیم اختر، علیم افسر، عظیم انور، مقیم انظر معاون رہے، میں ان پر نازاں ہوں اور میری اہلیہ نفیسہ نسیم میری قلندری اور شاعری کی نیاز مند رہی۔ میں اُن کی عالی ظرفی و تحمل پر ممنون ہوں۔

محمد نسیم انور ایوبی گنگوہی

فہرست

عرضِ مصنف

گنگوہ کا بانی گنگ پال پنوار گوجر راجہ عرف گنگ نیک دل، اخلاص مند آدمی رہا ہوگا کہ ۶۸۸ء میں اس نے اس قصبہ کو گنگ پور کے نام سے بسایا تھا۔ مگر بدلتے زمانے کے ساتھ یہ گنگ پور سے اُس کے نام کا بہتر اور خوبصورت روپ گنگوہ قرار پایا۔ مگر اس کے ہمراہ یہ المیہ بھی ہے کہ ۱۱۹۲ء میں یہاں کا جو گنگ راجہ تھا وہ ایک عیاش طبع ظالم و جابر شخص تھا۔ اس کی غلط روش کی بنا پر صحابیٔ رسولؐ حضرت ابوایوب انصاری کی اولاد ہرات و پنجاب و سندھ سے یہاں آ کر جنگ آزما ہوئی اور راجہ گنگ کے بعد یہاں مستقبل آباد ہوئی۔ گنگ پال کے اخلاص نے یہاں پر یگانۂ روزگار حضرات کو بودوباش کرنے پر مجبور کیا۔ ان میں ایک سے ایک بڑھ کر تعلیم یافتہ نفوس موجود تھے، ان کی علمی فراست و بصیرت کے دریا کے دھارے ہند کے علاوہ دوسرے ملکوں تک پہنچ چکے تھے، کہ ۱۵۲۶ء میں امام اعظم ابوحنیفہ کی اولاد میں سے قطب العالم حضرت شیخ عبدالقدوس قدس اللہ سرہ ردولی ضلع بارہ بنکی سے شاہ آباد ہوتے ہوئے یہاں تشریف فرما ہوئے۔ آپ چاروں سلسلے قادری، نقشبندی، سہروردی اور چشتیہ صابریہ کے زبردست شیخ وامام تھے۔ آپ کی آمد وقیام سے یہاں تصوف وروحانیت کا قدوسی دریا موجزن ہوگیا بلکہ آپ کے اخلاف و اولاد کے علوم کی فراوانی کے سبب یہ دریا بے کراں ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں یہاں پر ایک اور دریا کا اضافہ ہوا۔ جس کو ''رشیدی دریا'' کہا جاتا ہے۔ گنگوہ آج ایک ناپیدا کنار سمندر کی صورت اختیار کر گیا ہے جس سے ساری دنیا سیراب ہو رہی ہے۔ دانائی، بصیرت، فراست، سلوک و تصوف، علمیت وقابلیت اور روحانیت کے بدر و شمس اس زمین سے درخشاں ہوئے جنھوں نے جہانِ حیات کو تابناک بنا رکھا ہے اور چہرۂ ہستی پر گنگوہ کا نام ''نور و رنگ'' کے جلی حروف سے لکھ دیا ہے۔

مولانا محمود الحسن عثمانی دیوبندی اسیر مالٹا نے بلاشبہ مدرسہ رشیدی سے ہی علمی وسیاسی قیادت کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ نے تعلیم روحانی اور سیاسی رہبری کی سندیں اسی رشیدی تعلیم گاہ سے حاصل کی۔ مولانا محمد یحیٰ کاندھلوی والد ماجد حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم کی قلبی وروحانی تربیت یہیں گنگوہ کے مدرسہ رشیدیہ میں ہی ہوئی اور حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی تعلیم وتربیت اسی گنگوہ کے ماحول سے مکمل ہوئی۔ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے تبلیغی ذہن ودماغ کوعلمی مرکز رشیدیہ سے پایا اور تبلیغ کی ابتدا اسی قصبہ گنگوہ سے ہوئی۔ مولانا عبدالرحیم رائے پوری زیور سلوک وتصوف سے آراستہ ہوکر اسی گنگوہ سے مرصع ہوکر نکلے۔ مولانا خلیل احمد انبہٹوی اسی گنگوہ کے طفیل ''حضرت سہارنپوری'' مشہور عالم ہوئے۔ مولانا عبداللہ انبہٹوی رشیدی مدرسہ کے باکمال متعلم ہیں کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے۔ ریاست بڑودہ، ریاست بہاولپور، ریاست گنج پورہ کے وزیر اسی گنگوہ کے فرزند تھے۔ جن کے انتظام وانصرام کے طفیل اپنے اختتام تک یہ ریاستیں نہایت شان وشوکت کے ساتھ قائم ودائم رہیں۔

یہی وہ قصبہ ہے جہاں ابراہیم لودھی، بابر، ہمایوں، جہانگیر، شاہ جہاں اور شاہ فہد شاہِ سعودی عربیہ نامی گرامی بادشاہوں نے روحانیت کے شہنشاہوں کے درباروں پر عقیدت کے سجدے کیے ہیں دہلی میں جاگیروں سے متعلق بادشاہوں کے فرمان یہاں موجود ہیں۔ راجہ گنگ کے سکے بھی یہاں کئی شخصوں کے یہاں موجود ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ان کو دکھانے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ ہندوستان کا جلیل القدر بادشاہ ''مغل اعظم'' جلال الدین محمد اکبر کی سلطنت کا سب سے بڑا عہدیدار چیف جسٹس اسی گنگوہ کا تھا جن کا نام مبارک محدث وفقیہہ ومفتی وشیخ عبدالنبی قدوسی گنگوہی تھا۔ اکبر بادشاہ ان سے حدیث پاک سننے کے لیے ان کے مکان پر مؤدبانہ وخادمانہ جاتا تھا ادباً ان کو اپنے یہاں نہیں بلاتا تھا۔ یہ بادشاہ اپنے ہاتھوں سے ان کی جوتیاں سیدھا کرنا اپنے لیے سرمایۂ سعادت تصور کرتا تھا۔ ان سب کے باوجود یہی وہ قصبہ بھی ہے کہ جس کے حالات اجمالاً یا

تفصیلاً نہ کسی کتاب میں تحریر ہیں نہ یہاں کی کوئی قلمی یا مطبوعہ تاریخ ہے۔ ایسی صورت میں یہاں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ کیا لکھا جا سکتا ہے؟ بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کی تیرہ سو سالہ سال کی تاریخ یہاں کی مٹی میں دفن ہے —— گنگوہ پر یہ چند صفحات تحریر کرنے کی تحریک اس طرح ہوئی کہ غالباً ۱۹۹۰ء میں برادر عزیز قاضی رشید مسعود ایم پی کے مرکزی ہیلتھ منسٹر بننے پر جب میں ان کی قیام گاہ دہلی میں برائے مبارک باد گیا تھا تو وہاں بھائی راشد مرحوم خوشنود قدوسی، خورشید صابری مرحوم سجادہ نشین درگاہ صابری دریا گنج دہلی تحصیل نکوڑ وسہانپور کے جملہ ایم ایل اے اشوکا روڈ کوٹھی نمبر سات پر موجود تھے کہ کسی طرح گنگوہ کے راجہ گنگ کا تذکرہ چھڑ گیا کہ وہ راجپوت راجہ تھا اور پرتھوی راج چوہان کے خاندان سے تھا۔ اس وقت وہاں میری زبان سے یہ نکل گیا کہ اگر یہ راجہ راجپوت ہوتا تو یہاں خاص قصبہ میں بلکہ آس پاس کے دیہات میں بھی راجپوتوں کی آبادی زیادہ ہوتی کیونکہ پڑھنے اور سننے میں یہی معلوم ہوا ہے کہ راجہ جس برادری کا ہوتا ہے اس کے پاس اور اردگرد میں اسی کی برادری کی زیادتی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں تو یہ راجہ گنگ گوجر راجہ ہوگا اس لیے کہ گنگوہ اور اس کے نزدیک و دور چاروں طرف گوجروں کی آبادیاں ہیں اور اس علاقہ میں گوجر برادری کی زیادتی ہے —— میرے اس کہنے پر یہاں پر موجود چند حضرات نے نہ صرف میری بات کا رد کیا بلکہ خوب خوب مذاق اڑایا کہ ''تو ہمیشہ سب سے الگ بات کرتا ہے اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ رکھتا ہے —— ان میں سے کسی نے یہ بھی کہا کہ اپنی بات کو ثبوتوں کے ساتھ ثابت کر کے دکھاؤ کہ حقیقت کیا ہے۔ بلا دلیل بات کرنا بہتر نہیں ہوتا۔''

اس واقعہ کے بعد میں نے معلومات و تحقیق شروع کی تو معلوم ہوا کہ کسی کو آج تک مصدقہ طور پر یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ اس قصبہ کو کس نے کس سنہ میں بسایا۔ اس کا بانی کہاں کا اور کس برادری کا تھا —— میں نے کن کن مشکلوں سے کہاں کہاں سے معلومات حاصل کیں یہ تو الگ بات ہے اس پر تو کچھ کہنا نہیں ہے ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر اوّلین دور کے لوگ یہاں کے تاریخی واقعات تحریر کر دیتے تو مجھ سے ناکارہ شخص کو یہ اوراق لکھنے کی ضرورت نہ

پڑتی۔ جتنا اور جیسا اچھا بُرا لکھ سکا ہوں حاضر خدمت ہے جو لکھا گیا ہے روایت و درایت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ان اوراق میں جہاں جہاں میری ذاتی رائے ہے۔ اس سے اختلاف فطری بات ہے۔ میں نے چند ایسے عنوان بھی قائم کیے ہیں جن پر لکھنا ضروری نہیں تھا۔ مگر اس وجہ سے ان پر قلم اٹھایا گیا ہے کہ آنے والی نسل کے لیے یہ ایک معلوماتی دستاویز ثابت ہو سکے۔ تاریخی واقعات ایک وسیع موضوع ہے دیگر حضرات خامیاں گنانے کے بجائے اپنی معلومات اور واقعات کو اپنے طور پر تحریر فرمائیں اور مجھے بھی احساس دلائیں کہ فلاں موضوع پر ابھی لکھا جانا باقی ہے۔ میری کسی تحریر سے اگر کسی کی دل آزاری انجانے میں ہوگئی ہو تو درگزر فرمائیں۔

ہاں یہ ضرور کہنا پڑ رہا ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا آ رہا ہے۔ جب کوئی کتاب چھپ کر منظر عام پر آتی ہے تو کئی کرم فرما حضرات اس تخلیق کو تنقیدی نظر سے نہیں بلکہ تنقیصی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہیں ۔

جب بھی آتا ہے مرا ذکر تری محفل میں
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

یہ لوگ اکثر کبھی موضوعی لحاظ سے کبھی واقعاتی تسلسل کے طور پر کبھی زبان و بیان اور عبارت پر تنقید لے بیٹھتے ہیں۔ کبھی کہنے لگتے ہیں اس موضوع پر کم لکھا گیا ہے زائد لکھا جانا چاہیے تھا۔ تشنگی باقی رہ گئی۔ اگر بولنے کے لیے کتاب میں کچھ نہیں مل پاتا تو کتابت و طباعت ہی ہدف تنقیص ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ سب کچھ قلبی اور دماغی کبر وعصبیت کی بناء پر ہوتا ہے تنظیمی، تعمیری، علمی، اصلاحی اور ثقافتی ترقی میں رکاوٹ بننے والوں سے میری گزارش ہے کہ اگر کتاب میں واقعی کچھ لکھنا یا شائع کرنا رہ گیا ہے تو اس کی نشاندہی کی جائے۔ تاریخی معلومات فراہم کی جائیں نیز اگر اس موضوع سے متعلق کوئی شئے، کوئی واقعہ، کوئی معقول مواد، کچھ حالات ملیں تو ان کی حفاظت کی جائے اور مصنف کو مطلع کیا جائے تاکہ توفیق الٰہی شامل رہی تو دوسرے ایڈیشن میں یا اس مواد و معلومات کو الگ سے کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

محمد نسیم انور ایوبی

نسیم انور کسی کو یاد نہیں

اُس نے جب سے ہوش وحواس کی آنکھیں کھولی ہیں۔ اس کا جسم ودماغ، جدوجہد کے راستہ پر تنہا سفر کررہا ہے۔ ابتدائی مصیبت کے دنوں میں اپنوں سے مدد کا طالب ہوا تھا۔ مگر کسی نے حوصلے کے نام پر دو بول کہنا بھی گوارہ نہ کیا۔ مدد تو کیا دی جاتی تب سے تادمِ تحریر کسی کے آگے دستِ سوال نہیں بڑھایا۔ اکیلے اور خود اپنے خدا کے سہارے منزل مقصود پر پہنچنے کا ارادہ کرلیا اور آج وہ اپنے حالات سے مطمئن ومسرور ہے۔ لیکن زندگی کے اس سفر میں کیسے کیسے مشکل مقامات آئے، کتنے نشیب وفراز دیکھنے پڑے اور جان لیوا کتنے موڑ آئے، پاؤں میں نوکیلے کتنے کانٹے چبھے ہوں گے، لاتعداد چھالوں نے دل ودماغ کو کتنا بے قرار وبے جان کیا ہوگا یہ وہی جانتا ہے مگر آگے بڑھنا اس نے اپنی فطرت بنالیا تھا۔ کیونکہ اسے طعنے سننا پسند نہیں تھا اسے چیلنج قبول کرنا اور ان کو پورا کرنے میں اس کو لطف آنے لگا تھا۔ وہ سب کے کام آتا رہا۔ تدریسی پیشے کے ذریعے نہ جانے کتنے ذہنوں کو تعلیمی نورانیت سے منور کیا۔ متعدد لوگوں کو علم وفضل کی سندیں دلوائیں۔ بہت سوں کو شاعری کے فن میں ماہر وکامل بنادیا۔ احباب اور گنگوہ کے بزرگوں پر تبصرے لکھے، ہم عصر شاعروں پر مضامین لکھ کر ان کی حیات وشاعری کے نامعلوم گوشوں سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ بہت سی طالبات اور بہت سے طلبا کو بلا معاوضہ امتحانات کی تیاری کرائی۔ کئی کی طرف سے خود امتحان دے کر ان کو ٹیچر بنوایا۔ کئی حضرات کو دوران امتحانات ''رعایت'' دے کر قانون داں بننے کی راہیں آسان کرائیں۔ اس نے کسی کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ اور تو اور اس کے اپنے احباب بھی اس کا استحصال کرتے رہے۔ ایسے بے حسوں کے درمیان رہ کر وہ حرف شکوہ بھی زبان پر نہ لاسکا۔ ہاں ایک شخص ۱۹۵۶ء سے آج تک ضرور ہمراہ رہا ہے۔ جس کے ساتھ رہ کر ایک گونہ قلبی سکون رہا ہے۔ مگر اس قدیمی ساتھی نیر قریشی گنگوہی نے بھی اس کا ادبی وعلمی اعتراف نہیں کیا۔ کسی جریدے میں اس پر کوئی حرف نہیں لکھ سکا۔ البتہ دونوں زبردست دوست ہیں۔ مگر وضعداری، شرم وحیا اور خودداری اس کو پردہ دری سے منع کرتی رہی۔ مگر خوداعتمادی اُس کو جدوجہد پر اکسا کر بوڑھا کرتی رہی لیکن معراج وترقی وخوشحالی جوان بلکہ نوجوان بناتی رہی۔ وہ آج بھی گنگوہ والوں کا تعارف نام شہر بزرگ گنگوہ شریف کے نام سے لکھ کر سب کو یاد کررہا ہے۔

عمران عظیم ایڈوکیٹ، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

محلّہ محمد غوری

قائم شدہ 1206ء

یہ محلّہ قلعۂ گنگ سے جانب شمال واقع ہے۔ جہاں پر قلعۂ کی چڑھائی ختم ہوتی ہے وہاں سے یہ محلّہ شروع ہوتا ہے حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے ۲۹ ویں خلیفہ مولانا خواجہ شیخ محمد غوریؒ ہراتی کے نام نامی پر یہ محلّہ منسوب ہے اس محلّہ کے مشرق میں محلّہ ٹانکان جنوب میں محلّہ اشرا اور مغرب میں محلّہ اشرف علی ہے۔ حضرت محمد غوریؒ قطب الدین ایبک کی فوج میں ایک رسالہ کے افسر تھے۔ ۱۲۰۶ء میں بادشاہ نے اپنے چیف جسٹس قاضی شمس الدین اولاد حضرت امام ناصر الدین جالندھری کی سفارش پر اور اُن انصار کی منشا پر جو راجہ گنگ کی فوج سے جنگ آزما تھے اور جو شہید ہونے سے بچ گئے تھے دہلی میں پرتھوی راج چوہان کی قید میں پڑے ہوئے تھے۔ جب ان کی پرسش ہوئی اور ان کو رہا کیا گیا تو انھوں نے بادشاہ سے گذارش کی کہ ہم کو وہیں بھیج دیا جائے جہاں ہمارے برادران شہید ہوئے ہیں اور جہاں ان کے مزارات ہیں چنانچہ بادشاہ نے شاہ محمد غوری کی سرکردگی میں تھوڑی سی فوج غوریوں کی انصار کے ہمراہ گنگوہ روانہ کی۔ گنگوہ پہنچ کر انصار اور فوجِ غور نے راجہ گنگ کی بقیہ فوج سے جنگ کر کے گنگوہ کو مکمل طور پر فتح کیا۔ مگر غوریوں کی فوج کے سردار خواجہ محمد غوری اور چار انصار بھی شہید ہو گئے۔ شاہ محمد غوری کا مزار شہر پناہ کی شمالی دیوار کے نیچے آج بھی موجود ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ تکیہ کی طویل و عریض زمین آج بھی موجود ہے جو کسی کے قبضہ میں نہیں ہے۔ ۱۹۷۸ء تک یہاں ایک پرانا لمبا چوڑا کنواں موجود تھا جس سے عوام الناس پانی بھرتے تھے مگر پانی خشک ہو جانے کی وجہ سے یہ کنواں مٹی سے بھر دیا گیا ہے۔

حضرت مولانا خواجہ شیخ شاہ محمد غوریؒ ہراتی صاحب نسبت متدین عالم، صالح، صاحب صلاح وفلاح، نیک نفس اہل نظر اور باکمال افراد میں سے ایک تھے۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے یہاں حاضر باش اور آپ کے مرید و خلیفہ تھے مگر اُس زمانے کے

جہادی ماحول کی مناسبت سے اسلامی فوج میں ملازم تھے۔ شاہ محمد غوریؒ، حضرت خواجہ شیخ علاؤ الدین علی احمدؒ صابر کلیری، حضرت خواجہ، شیخ نظام الدین اولیاء دہلویؒ اور حضرت خواجہ شیخ جمال الدینؒ ہانسوی کے پیر بھائی ہیں[1]۔ گنگوہ کے محلّہ محمد غوری کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس محلہ میں گنگوہ کے سب سے پہلے امام الاولیاء سرگروہ شہدا حضرت مولانا شیخ خواجہ امام ابومحمد آخونؒ، حضرت شیخ خواجہ مولانا محمد غوریؒ، حضرت مولانا شیخ محمد ابراہیم، حضرت مولانا شیخ حمید الدین پیر پاپڑی والے، دو شہداء قاضی فخر الدین سکنہ محلّہ محمد غوری کے مکان میں اور دروازہ کے قریب چار شہدا حضرت امام صاحب قدس سرہٗ کے ہمراہی حضرت کے مزار کے سامنے۔ اور پیر برگد والے اور چھوٹے ڈپٹی والے باغ میں ہیروز ہائی اسکول کے قریب شمال میں آرام فرما ہیں گویا معلوم شہدا اس محلّہ میں ۱۴ حضرات آرام فرما ہیں۔ اسی محلّہ میں عربی تعلیم کا زبردست مرکز مدرسہ اشرف العلوم قدیم کا کچھ حصہ اور مدرسہ جدید ہے اسی محلّہ میں مدرسہ اشرف العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا وسیم احمد سنسار پوری اور اس مدرسہ کے نائب ناظم مولانا مفتی محمد خالد سیف اللہ رہتے ہیں۔ اسی محلّہ میں بڑا سرکاری ہسپتال اور ٹیلیفون ایکسچینج، پولیس اسٹیشن، بس اسٹینڈ، کوآپریٹیو بینک، کوآپریٹیو سوسائٹی، بلاک، ہائی اسکول، گیس ایجنسی، سینما، مویشی ہسپتال کئی پرائیویٹ اسکول، کئی پرنٹنگ پریس ہیں۔ اس محلّہ میں چھ مسجدیں ہیں۔ راقم الحروف محمد نسیم انور ایوبی بھی اسی محلّہ کا ایک فرد ہے۔ اور حضرت محمد غوریؒ کا ہمسایہ ہے انھیں کے زیر سایہ رہ کر ان کا معمولی سا تذکرہ لکھ رہا ہے۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ محلّہ گنگوہ کا دل و دماغ ہے تو بجا ہے کیونکہ آپ نے دیکھا ہے کہ جملہ ضروریات کی اشیاء قریب قریب یہاں موجود ہیں اور بزرگوں کے مزارات برکت کے لیے مزید ہیں گویا پوری گنگوہ ہی اس محلّہ میں سمٹ آئی ہے۔ کیونکہ یہ محلّہ سرور عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک سے شروع ہوتا ہے۔ اور جو بھی شئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہوتی ہے وہاں رحمت و کرامت خود بخود کھینچ کر آجاتی ہے۔

---

[1] خیر المجالس، خزینۃ الاصفا، ۳۰۳ء، جلد اول، جواہر فریدی، ۳۴۲،

خواجہ محمد ادریس کیفؔ بھوپالی

یاایُّہاالگنگوہ

۸؍جون ۱۹۸۹ء

غریب شہر غریبی پہ سوگوار نہ ہو
بجھا بجھا سا چراغ سر مزار نہ ہو

جمال شہر مکانات پر نہیں موقوف
سفید و سُرخ عمارات پر نہیں موقوف

مکاں کا حُسن، مکیں سے ہے بام ودر سے نہیں
بدن کا رنگ لہو سے ہے بال و پر سے نہیں

مجھے خبر ہے کہ تیرا بھی اک زمانہ تھا
تو ایک شہر نہیں تھا، نگار خانہ تھا

اسی دیار میں تھی ذات حضرت قدوسؒ
کہ جن کے ساتھ رہا ہے ملائکہ کا جلوس

کُھلا رہا درِ میخانۂ رشیدؒ یہاں
تھی دستیاب بہت روح کی کشید یہاں

کل اِس دیار سے اُبھری تھیں صورتیں کیا کیا
''اِلٰہی رحم کن آں عاشقانِ پیشیں را''

قدم قدم پہ یہہ بستی دُہائی دیتی ہے
مگر کچھ اگلی شرافت دکھائی دیتی ہے

اسی زمیں پہ ہیں عبدالحمید صوفی بھی
کہ جن کی صورت وسیرت تمام معصومی

شفیقؔ بھی ہیں یہاں اک طبیب رشکِ عراق
حکیم و حاکم و حمام کہنہ کے مصداق

اسی دیار میں قاضی نعیمؔ ایوبی
ہراک عمل میں وہ رکھتے ہیں شان محبوبی

اسی دیار کے شاعر ہیں انورؔ ایوبی
ہر ایک شعر میں ہے سو جمال و سو خوبی

اسی دیار کے فرزند ہیں ظہیرؔ اختر
بہت ہی کم ہے جو لکھئے ہزارہا دفتر

اسی زمیں پہ ہے نیّرؔ قریشی کی ہستی
کہ جن کے اک اشارے پہ ہے یہ سب بستی

نعیمؔ عظمتؔ و اکرمؔ عظیمؔ اور زائرؔ
ہیں اس دیار میں کتنے ہی خوش نظر شاعر

اسی دیار کے چشم و چراغ ہیں کوثرؔ
لباس سادہ میں عالی دماغ ہیں کوثرؔ

اِسی دیار میں اشفاقؔ و یوسفؔ و عارفؔ
ہیں مثل میوہ و انگور گلشن طائف

اسی دیار میں شبیرؔ و جوہرؔ و گوئلؔ
کِھلا رہے ہیں گل نو بہار شعر وغزل

اسی زمیں پہ منورؔ ہے نوجواں فنکار
خدا نے اس کو بنایا ہے صاحب کردار

اسی کو جان غزل انتخاب کرتا ہوں
اسی کے نام یہ نظم انتساب کرتا ہوں

سُنا ہے راجہ یہاں کا تھا اک بڑا عیاش
سدا ہی رہتی تھی اس کو سُہاگنوں کی تلاش

نہ اس کے ساتھ سے محفوظ تھے حسین بدن
ہوس کے سیج پہ رہتی تھی نو بیاہی دُلہن

کہ آئی غیرت حق جوش پر تو یوں آئی
ہرات میں ہوئی انصار کی صف آرائی

مجاہدوں نے پئے امن بول دی یلغار
اگرچہ چند نفر تھے وہ پیدل اور سوار

خدا کے حکم سے گنگوہ فتح کر ڈالا
زمیں سے ہو گیا نابود اس کا رکھوالا

غرض کہ چھٹ گئے سب ظلم و جور کے سائے
وہ مومنین تھے جو ہندوؤں کے کام آئے

سُہاگنوں پہ یہہ دنیا حرام آج بھی ہے
اُٹھو، بڑھو کہ مسلماں کا کام آج بھی ہے

■■

مخدومی کیف بھوپالی، گنگوہ کے مشائخ کے مزارات کی زیارت اور ایصالِ ثواب کے لیے یہاں تشریف لائے تو آپ کا قیام نیرؔ قریشی کے گھر اور ہمارے یہاں رہا۔ آپ کے اعزاز میں کئی محلوں میں مشاعرے اور نشستیں ہوئیں۔ یہ نظم فی البدیہہ اسی دوران لکھی گئی۔ اُس وقت جو حضرات موجود تھے صرف انھیں کے نام اشعار میں آسکے ہیں ورنہ یہاں شعراء کی کافی تعداد ہے۔ جن کی ایک طویل فہرست ہے۔

محمد نسیم انورؔ ایوبی

علم خدا شناسی اور خود شناسی

اپنے احوال وحالات کا اظہار وبیان بلا مبالغہ خواہ تقریر سے ہو یا تحریر سے۔ جب تک دنیا کے سامنے نہیں لایا جائے گا تو بہتر سے بہتر شئے بھی عوام وخواص کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے گی۔ اس لیے ہر دور میں ضروری امر رہا ہے کہ اپنے اسلاف کے کارنامے، علمی ورثے، نسب نامے بے کم وکاست منظر عام پر لائے جائیں۔ اور ان امور وعلامات کا اظہار کیا جائے جن کا دنیا کے سامنے لانا ضروری ہے۔ اس مدعا کو بیان کرنے کے لیے روایت، درایت، دلائل وبراہین کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اس شئے کے اظہار اور اس کی ترویج وتفسیر کی — تب کہیں جا کر معاصرین آپ کی بات کا یقین کرسکیں گے نیز تاریخی حوالے آپ کی بات کو صداقت کی میزان پر پورا ثابت کرسکیں گے — اللہ کی سنت اور دنیا کا اصول ہے کہ قومیں حرکت قوتِ نمو اور علم وعمل سے زندہ رہتی ہیں۔ ہر زمانے میں چار اصولوں کو زندہ قومیں سامنے رکھتی ہیں جو ان کے وجود کی بقا اور تحفظ کی ضمانت دیتے ہیں:

(۱) اپنے مذہب کا علم، اس کا حصول وادراک، اس پر عمل اور اس کی حفاظت
(۲) اپنی تہذیبی، ثقافتی، علمی، اعلیٰ اقدار کا احساس وتحفظ
(۳) اپنی تاریخ، اپنی زبان وادب کی معلومات وحفاظت
(۴) اپنی معاشی استواری اور ترقی کا مطلوبہ عمل

لہٰذا ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو ہمیں اپنے افراد اپنے سماج اور اپنے اداروں کی تعمیر وتشکیل خود ہی کرنی ہوگی۔ اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ اخلاق سے خود کو متصف کرنا ہوگا اپنی تہذیب، اپنی تاریخ، اپنی زبان اور اپنی معیشت کو کما حقہ سمجھنا ہوگا۔ ان کی تبلیغ ان کی ترویج پر عمل اور ان کا تحفظ کرنا ہوگا۔ بے حسی کا جوا، اپنے شانوں سے اتار کر

---

[1] ڈاکٹر حیات عامر حسینی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

معذرت خواہانہ انداز ترک کر کے برابری کی سطح پر آ کر تمام مخالف معاصر قوتوں کے مد مقابل آنا ہوگا— آج فکر وتدبر اور کمپیوٹر سائنس کا دور ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہر علم کے ضروری حصوں سے فائدہ اٹھائیں۔ کیونکہ علم کی مخالفت نہ عقلاً درست ہے نہ شرعاً— اور تاریخ وہ آئینہ ہے۔ جس کے سامنے کھڑے ہوکر ہر شخص کا جغرافیہ من وعن عیاں و بیاں ہونے لگتا ہے اور ضمیر و وجدان کی گپھاؤں میں چھپے ہوئے انسان کی علامات فراہم ہونے لگتی ہیں۔ جب سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اور انسان نے خطۂ ارضی پر قدم رکھا ہے تب سے ہی ''علم خداشناسی'' اور ''خودشناسی'' کا شعور عمل پذیر رہا ہے۔ زیادہ تر علوم، عقل و شعورِ انسانی* کی اختراعات سے عالم شہود پر آئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو آپ کو ''علم لوازمات'' سے پوری طرح آگاہ فرمایا۔ جس کی تصدیق کلامِ الٰہی کی اس آیت سے ہوتی ہے: وَ عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا یعنی تمام علوم کا مرکز ومصدر آدم صفی اللہ کا علم مبارک ہے۔ تمام علوم کی ابتدا نبیوں اور رسولوں سے ہوئی ہے جن کی تفصیل وتشکیل علماء وحکما کے ذریعے ہوئی، جنھوں نے ہر زمانے میں ان کی تحقیق وتفسیر میں اپنی عمریں صرف کر دیں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسا قیمتی سرمایہ چھوڑ گئے جو ہمیشہ کے لیے کار آمد ہو۔ زندگی کی انگنائیوں میں ہر سمت رنگینیاں، رعنائیاں اور نیرنگیاں بکھری پڑی ہیں ان سے لطف اندوز ہونے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے— مگران نظاروں سے وہی لوگ لطف اٹھا سکتے ہیں جو ''حسِ لطیف'' کے حامل ہوتے ہیں۔ مشیت ایزدی بھی اُسی وقت رہبری کرتی ہے جب لوگ تگ ودَو اور دوراندیشی کے تقاضے پورے کرتے ہیں تب ہی ان کا ادراک ''رفعت آشنائی'' سے سرخرو ہوتا ہے۔ علم خود آشنائی کا احساس کوئی بُری شئے نہیں۔ اس کے رموز سے آگاہی ہونے کے بعد، انسان خداشناس ہو جاتا ہے اور خداشناس انسان سب کا ہمدرد بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

اگر تاریخ کا مطالعہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کیا جائے تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ دنیا

میں کوئی قوم بھی صفحۂ ہستی پر اُس وقت تک نمایاں نہیں ہو سکتی جب تک وہ خود کو مکمل طور پر زیورِ علم سے آراستہ نہ کر لے۔ بے علمی اور تاریخ اسلاف سے ناواقفیت وہ بُری بلا ہے جو سر چڑھ کر بولتی ہے اور گہرے سمندروں میں ڈبو دیتی ہے۔ یہی نہیں برسہا برس تک تہہِ سمندر میں پڑے رہنا، اس کا مقدر بن جاتا ہے لیکن وہ قومیں زندہ، فعال اور باشعور تصور کی جاتی ہیں۔ جنھوں نے اپنے آباواجداد کے کارناموں کو یاد رکھا ان کی روایت، ان کی وراثت، ان کے علمی، اصلاحی، ثقافتی، تہذیبی اور اخلاقی سرمایوں کو محفوظ کر کے نہ صرف ان پر عمل پیرا ہوئے بلکہ ان کی واقفیت سے اپنی خاندانی شرافت وشناخت کو باقی رکھا ہے۔ کیونکہ یہی موروثی اثاثے ان کو متحرک رکھتے ہوئے ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچاتے ہیں۔ اور جو قومیں بے علم رہ گئیں، وہ خود فراموش ہو گئیں۔ جن قوموں میں علم کا فقدان ہوتا ہے وہ قومیں یہ تک بھول جاتی ہیں کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، ہمارا سلسلۂ نسب کیا ہے؟ حالانکہ نسب کی معلومات کے بارہ میں حدیث پاک موجود ہے: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم لوگ اپنے نسب یہاں تک معلوم کرلو جس سے قرابتوں کے ساتھ نیک سلوک کر سکو'' [1] اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''انا خلقنا کم الخ [2] اے آدمیو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے۔ اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے۔ تا کہ آپس کی پہچان ہو تحقیق اللہ تعالیٰ کے یہاں اسی کو بڑائی ہے۔ جس کو ادب بڑا۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور خبردار ہے۔''

اکثر غیبت، طعن، تشنیع اور عیب جوئی کا منشا کبر ہوتا ہے کہ اپنے کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اسی کو فرمایا کہ اصل میں انسان کا بڑا، چھوٹا یا معزز وحقیر ہونا۔ ذات پات اور خاندان ونسب سے تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ جو شخص جس قدر نیک خصلت مؤدب اور پرہیز گار ہوگا۔ اسی قدر اللہ کے یہاں معزز ومکرم ہے۔ نسب کی حقیقت تو یہ کہ سارے آدمی ایک عورت اور ایک مرد یعنی آدمؑ اور حواؑ کی اولاد ہیں۔ شیخ، سید، مغل، پٹھان، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی اور انصاری سب کا سلسلہ آدم وحوا پر منتہی ہوتا ہے۔ یہ ذاتیں اور خاندان اللہ تعالیٰ نے محض تعارف وشناخت کے لیے مقرر کیے ہیں۔ بلاشبہ جس کو حق تعالیٰ

---

[1] ترمذی شریف [2] پارہ ۲۶، رکوع ۱۳، سورۂ حجرات

کسی شریف اور بزرگ ومعزز گھرانے میں پیدا کردے تو وہ ایک موہوب شرف ہے۔ جیسے کسی کو خوبصورت بنا دیا جائے لیکن یہ چیز ناز اور فخر کرنے کے لائق نہیں کہ اسی کو فضیلت وکمال کا معیار ٹھہرالیا جائے۔ اور دوسروں کو حقیر سمجھا جائے۔ ہاں شکر کرنا چاہیے کہ اس نے بلا اختیار وکسب ہم کو یہ نعمت مرحمت فرمائی۔ شکر یہ میں یہ بھی داخل ہے کہ غرور وتفاخر سے باز رہے۔ اور اس نعمت کو کمینہ اخلاق اور بری خصلتوں سے خراب نہ ہونے دے۔ بہر حال مجد وشرافت اور فضیلت وعزت کا اصل معیار نسب نہیں۔ تقویٰ طہارت ہے۔ اور متقی آدمی دوسروں کو کب حقیر سمجھے گا؟ [1]

حدیث شریف سے نسب کی معلومات وحفاظت کرنا واضح ہوگیا۔ اور قرآن پاک سے ذاتوں اور قبیلوں کی تصدیق ہوگئی۔ لہٰذا اپنے نسبوں، ذاتوں، قبیلوں اور شاخوں کی یادداشت رکھنا اور ان کا اظہار و بیان اور ان کا یاد رکھنا کوئی بری بات نہیں۔ البتہ اپنے نسب کو اعلیٰ اور دوسروں کے نسب کو ادنیٰ اور حقیر کہنا غیر مناسب ہے۔ دراصل حضرت آدمؑ کے ہر بیٹے کی اولاد جدا جدا مقامات پر رکھی گئی۔ یہ سلسلہ مدتوں چلتا رہا۔ حتیٰ کہ آدمی تمام دنیا میں پھیل گئے۔ چنانچہ بہ سبب بُعدِ زمانہ اور فاصلۂ آبادی کی بناء پر آپس میں فرق وامتیاز واقع ہوتا گیا۔ اور یہ امتیاز اس وقت اور مزید ہوگیا جب ایک جماعت علم حاصل کر کے مہذب وشائستہ بن گئی اور دوسری بے علمی وجہالت کی وجہ سے وحشی اور غیر مہذب رہ گئی یہی بے علمی وجہ خود فراموشی قرار پائی اور قبیلوں میں نسبی افتراق وامتیاز بڑھتا چلا گیا۔ اور اپنی اصل ونسل سے ناواقفیت کی فصیل طویل ہوتی گئی حتیٰ کہ یہ خبر تک نہ رہی کہ ہمارے جلیل القدر اسلاف کے کیا کیا کارنامے تاریخ میں محفوظ ورقم ہیں وہ ہمارے عالم میں کیوں کر اعزاز وعظمت کی بلندی پر مقیم تھے۔ ان کا ظاہر وباطن ایک مصفا ومجلّٰی آئینہ ہے۔ زمانہ ان کی عالی ہمتی، جوہر شرافت کی تاباں قابلیت کا بجا طور پر معترف ہے۔ ان کے اور ان کے علم وفنون سیاسی وتمدنی مراتب کے علاوہ صرف ایک تاریخ نویسی اور علم الانساب کے محفوظ رکھنے اور نسبی جوہر کے کھرے کھوٹے کے امتیاز میں جس طرح ان کا تبحر علمی شامل تھا۔ دنیا میں آج تک کوئی

---

[1] حاشیہ قرآن پاک، ص ۶۷۳، شاہ فہد قرآن شریف پرنٹنگ کمپلیکس مدینہ منورہ ۱۹۹۳ء، مفسر، علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی

قوم نہیں جوان کی ہمسری میں قدم آگے بڑھا سکے۔ ہمارے بزرگوں کی فراست دنیوی، وجاہت دینی، شرافت نسبی، سیاست عمومی قیادت ملّی، بصارت علمی ابھی بھی عالم میں ضرب المثل ہے۔ موجودہ دور میں بھی ان کی سبق آموز زندگی کے واقعات اوران کی رموز وحکمت روحانیت کا فیضان ہی ہمارا دستگیر ہوسکتا ہے۔ اپنے اسلاف کے حالات، واقعات، ان کی خدمات، ان کے ذاتی اوصاف اوراصل ونسل کی اہم معلومات سے واقفیت ہی اب ہمارے لیے رہبرو جہاں نما ہے۔ جبکہ موجودہ نسلیں ان کے کارناموں کو کیا یاد رکھتیں۔ یہ تو ان کے نام تک نہیں جانتیں۔ ہندوستان میں آنے اور بسنے کے بعد ایسے مصروف و بے پرواہوئے کہ سب کچھ فراموش کر گئے۔

انصار

انصار جمع ہے ناصر یا نصیر کی اور ناصر کے معنیٰ ہیں مدد کرنے والے کے۔ چنانچہ پارہ دس سورۂ توبہ رکوع (۹) میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَالَّذِیۡنَ ''آوَوْ وَّنَصَرُوا'' اور جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی۔ اس لفظ کا اطلاق اُن ساکنان مدینہ پر ہوا ہے۔ جنھوں نے مہاجرین اوراسلام وپیغمبراسلام کی مدد کی۔ انصار کہلائے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ایمان کی علامت انصار کی محبت ہے اور منافقوں کی علامت انصار سے بغض ہے''۔ [1] امام احمد بن حنبلؒ نے امیر معاویہ سے نقل کیا ہے کہ جس نے انصار کو محبوب رکھا۔ خدا اس کو محبوب رکھے گا اور جس نے انصار سے بغض رکھا خدا، اس سے بغض رکھے گا''۔

انصار کے جدِ اعلیٰ

چھٹی عیسوی کے مورخ الہمدانی نے لکھا ہے کہ شہر عبار میں شداد بادشاہ نے ارم نامی جنت بنائی تھی جو اپنی عمارتوں کی طرز تعمیر، باغات اور خوش حالی وثروت کے لحاظ سے سارے عالم میں مشہور تھی۔ حضرت ہود علیہ السلام کو عام طور سے عابر کہا جاتا ہے۔ شہر عبار آپ کے نام سے ہی موسوم ومنسوب ہے۔ حضرت کے پوتے یعرب بن قحطان کی اولاد یمن میں آباد تھی اور انصار مدینہ کا سلسلہ انھیں سے منتہی ہوتا ہے۔ حضرت حسان بن ثابت نے اپنے اشعار میں

---

[1] ابن شیبہ ونسائی

اس کا اظہار کیا ہے۔ اے باشندگانِ عرب تم نے عربی زبان ہمارے باپ سے سیکھی ہے۔ جس کی وجہ سے تم لوگ عربی زبان جان گئے ہو ورنہ تمہارے پاس عجم کی زبان کے علاوہ کوئی کلام نہ تھا اور غیر آباد زمینوں میں تم چوپایوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔"

بقول سبائک الذہب، یعرب بن قحطان فصحائے عرب میں اول درجہ کے فصیح مانے جاتے تھے۔ عربیت انھیں کی طرف منسوب ہے، سرزمین عرب میں قحطان اور عدنان کی اولاد کی بڑی آبادی تھی۔ قحطانی سلسلہ میں اوس وخزرج وانصاریان مدینہ منورہ ہیں۔ اسی سلسلہ میں سبا کی اولاد میں یمن والوں نے ایسا عروج حاصل کیا جو اس کے بعد کسی دوسرے کو میسر نہیں ہوا۔[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے ڈھائی ہزار سال پہلے دنیا میں آپ کا سب سے پہلا امتی سبا بن یشجب بن یعرب

امام احمد حضرت ابن عباس سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کیا کہ سبا جس کا قرآن پاک میں ذکر ہے۔ یہ کسی مرد یا عورت کا نام ہے یا کسی زمین کے کسی حصہ کا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایک مرد کا نام ہے۔ جس کی اولاد میں دس لڑکے ہوئے۔ جن میں سے چھ یمن میں آباد ہوئے اور چار شام میں چلے گئے۔ یمن میں رہنے والوں کے نام یہ ہیں (۱) مدحج (۲) کندہ (۳) ازد (۴) اشعری (۵) انمار (۶) حمیر۔ ان چھ لڑکوں سے چھ قبیلے پیدا ہوئے۔ جو انھیں مذکورہ ناموں سے معروف ہیں اور شام میں بسنے والوں کے نام یہ ہیں (۱) لخم (۲) جذام (۳) عاملہ (۴) غسان۔ ان کی نسل کے قبائل انھیں ناموں سے مشہور ہوئے۔ یہ روایت حافظ امام ابن عبدالبر نے اپنی کتاب **القصد والامم لمعرفة الانساب العرب والعجم** میں نقل کی ہے۔ سبا بن یشجب بن قحطان یمن کا سب سے پہلا بادشاہ ہوا ہے جس نے چار سو چوراسی سال سلطنت کی ہے۔ اس کا اصلی نام عبد شمس تھا۔ اگر چہ اس کے اور بھی کئی نام حارث، رائش، اور سبا مشہور تھے۔ چونکہ اس نے عرب میں غلامی کا سلسلہ ایجاد

---

[1] مراۃ الانساب، ص ۱۲۰

کیا تھا کیونکہ ''سبی'' قیدی کو کہتے ہیں اس لیے اس کا یہی لقب اس کا نام مشہور ہو گیا۔ مورخین نے سبا کو مسلمان تحریر کیا ہے۔ وہ دنیا میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا امتی ہے۔ تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے ہی آپ پر ایمان لے آیا، اور اس نے اپنے زمانے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزماں کی بشارت سنائی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کو اس کا علم کتب قدیمہ تورات، انجیل یا نجومیوں، کاہنوں کے ذریعے ہوا ہو۔ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں اس نے اشعار بھی کہے ہیں — آپ کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے یہ تمنا کی ہے کاش میں اُن کے زمانہ میں ہوتا۔ سبا کے اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

سیملک بعدنا ملک عظیم نبی لا یرخص فی الحرام

ہمارے بعد سلیمانؑ ایک بڑا بادشاہ ہوگا جو نبی ہوں گے اور کسی فعل حرام کی اجازت نہ دیں گے۔

و یملک بعدھم منا ملوگ یصیر الملک فینا بانقسام

اور ان بادشاہوں کے بعد جو حضرت سلیمانؑ کے بعد ہوں گے ہم میں سے بہت بادشاہ ہوں گے اور ملک باہم تقسیم ہوگا۔

و یملک بعد القحطان النبی تقی مخبت خیر الانام

اور قوم قحطان کے بعد ایک نبی مالک ہوں گے جو متقی، شب بیدار اور تمام مخلوق سے بہتر ہوں گے۔

یسمی احمد ایالیت انی اعمر بعد مبعثہ بعام

ان کا نام احمد ہوگا اے کاش میں ان کی بعثت کے ایک برس کے بعد تک زندہ رہتا۔

فاعضدہٗ و اجرہٗ بنصری لکل مدحج و بکل رامی

تو میں ان کی اعانت کرتا اور ان کے لیے ہر مسلح کامل تیرانداز کو ساتھ لے جاتا۔

متی یظھر فکونوا ناصریہ و من یلقیٰ بلغہٗ سلامی

جب وہ ظاہر ہوں تو ان کا مددگار رہنا۔ اور جو ان سے ملے میرا اسلام پہنچا دے۔

شہر سبا اسی بادشاہ کا بسایا ہوا ہے۔ اسی مناسبت سے اس شہر کو سبا اور جو قوم یہاں موجود تھی اس کو بھی سبا کہا جانے لگا۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ سبا یمن کے بادشاہ اور اس ملک کے باشندوں کا لقب ہے۔ تبابعہ جو اس ملک کے مقتدر اور پیشوا تھے وہ بھی اسی قوم سبا سے

تھے۔ملکہ بلقیس جس کا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ سورۂ نمل میں ہے وہ بھی اسی قوم سے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر اپنے انعامات اور رزق کے دروازے کھول دیے تھے۔اور ان کے شہر میں آرام وعیش کے تمام اسباب مہیا کرائے تھے،سورۂ سبا میں ان کی مرفہ حالی کا مفصل تذکرہ ہے۔کلام الٰہی کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم سبا انعامات خداوندی سے نفع اٹھاتے ہوئے زمانہ دراز تک اللہ تعالیٰ کی عبادت وشکر گزاری میں مشغول رہی کیونکہ ''رب غفور'' جملہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے اور جو دینی و دنیوی نعمتیں ان کو دی گئی ہیں ان پر مواخذہ نہ کیا جائے اور یہ بغیر اس کے کہ وہ مومن ہوں ممکن نہیں۔قحطان،یشجب اور سبا موحد و مومن تھے[1]

دنیا میں پیدائش محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہزار سال پہلے آپ کا دوسرا امتی اور عاشق رسول

تبع الحمیری یمنی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے ایک ہزار سال پہلے یمن میں ایک بادشاہ تھا جو تبع الحمیر ی کہلاتا تھا اس کا اصلی نام حمیر بن وردع قحطانی ہے یہ ملک تبع کے نام سے مشہور تھا۔محمد اسحاق اپنی کتاب مغازی میں لکھتے ہیں کہ تبع اُن پانچ بادشاہوں میں سے ایک تھا جنھوں نے کائنات ارضی پر قبضہ جما رکھا تھا۔ یہ بادشاہ ایکبار گرد ونواح کے علاقوں کو فتح کرنے کے لیے یمن سے نکلا اور فتوحات کرتا ہوا جب مکہ مکرمہ کے پاس پہنچا تو اہل مکہ اس کے لشکر سے نہ تو مرعوب ہوئے اور نہ اس کی شان ودبدبہ سے ہراساں ہوئے تو وہ بہت غضبناک ہوا اور مرعوب نہ ہونے کی وجہ دریافت کی۔اس کے وزراء میں سے کسی نے بتایا کہ یہ اہل مکہ اس بات پر نازاں ہیں کہ یہاں بیت اللہ شریف ہے۔اور یہ اس کے پاسبان ہیں اس لیے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔بادشاہ نے غصہ کے عالم میں حکم دیا کہ شہر کو تباہ و برباد کردو اور اس کے باشندوں کو قتل کردو۔اس حکم کے جاری ہوتے ہی وہ ایک پُراسرار بیماری میں مبتلا ہو گیا۔اس کے کان،ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔بہت علاج ہوا مگر افاقہ نہ ہو سکا۔آخرکار لوگوں کے کہنے سے توبہ کی تو وہ بیماری فوراً رخصت ہوگئی۔اس کے بعد بادشاہ نے

---

[1] اشاعت الاسلام،ص ۲۴۵،مولانا حبیب الرحمٰن ناظم دارالعلوم دیوبند،۱۳۵۱ھ

خانہ کعبہ کا طواف کیا اور وہاں کی صفائی کرائی اور بتوں کو تڑوا کر باہر پھنکوا دیا۔ اہل مکہ کی شاندار دعوت کی اور نایاب قسم کے ریشم سے کعبۃ اللہ کا غلاف تیار کرایا اور کعبہ کی خوب خوب آرائش کرا کر دروازہ مقفل کر کے چابی مجاوروں کے سپرد کر کے رخصت ہوا کئی علاقوں کو فتح کرتا ہوا شہر یثرب جا پہنچا۔ اہل یثرب مقابلے کی تاب نہ لا کر قلعہ بند ہو گئے کئی مہینے تک جب وہ شہر کو فتح نہ کر سکا تو حالات کی جستجو کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ اس کے سپاہیوں کے خیموں کے باہر کثیر تعداد میں کھجوروں کی گٹھلیاں پڑی ہیں تو اس کو خیال ہوا کہ ان کے زادراہ میں کھجوروں کا نام ونشان تک نہیں تو پھر یہ کھجوریں کہاں سے آئیں اس نے لشکریوں سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ رات کے آخری پہر میں قلعہ والے کھجوروں سے بھری ہوئی بوریاں پھینکتے ہیں جنھیں ہم روزانہ کھا لیتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا یہاں کے لوگ عجیب ہیں ہم ان کو قتل اور برباد کرنے آئے ہیں اور یہ ہم سے دوستوں والا سلوک کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے یثرب کے اکابر سے رابطہ قائم کر کے ان سے اس کا سبب معلوم کیا۔ یثرب کے لوگوں نے کہا ہم یہاں کے باشندہ نہیں۔ ہم نے تورات اور زبور جیسی الہامی کتاب میں پڑھا ہے کہ یہاں نبی آخرالزماں آنے والے ہیں یہ مقام ان کا دارالہجرت ہوگا اور ہم یہاں رہ کر ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہماری کتابوں اور آسمانی صحیفوں کے مطابق پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم حلیم وکریم اور شفیق وانیس ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت مہمان نواز بھی ہوں گے۔ اس لیے ہم بھی اپنے آپ میں ان جیسی صفات کریمہ سے متصف کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' تبع الحمیری اہل یثرب کی ان باتوں اور حسن سلوک سے بہت متاثر ہوا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ وہ نبی ابھی مبعوث بھی نہیں ہوئے لیکن ان کے اوصاف کریمہ پر لوگوں نے عمل کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ اس پر رقت طاری ہوگئی اور اس کا شوق دیدار بڑھ گیا وہ آج فاتح نہیں، مفتوح تھا۔ بے ساختہ کہہ اٹھا۔

شھدت علی احمد انّہٗ رسول من اللّٰہ باری النّسیمُ

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسولِ برحق ہیں۔

فلو مد عمری الیٰ عمرہ　　لکنت وزیراً لہٗ وابن عمٖ

اور اگر میری عمران تک پہنچی تو میں ضرور ان کا معین اور مددگار رہوں گا۔

و جاھدت بالسیف اعداءہٗ　　و فرجت عن صدرہٗ کُلُ غمٖ

اور ان کے دشمنوں سے جہاد کروں گا اور ان کے دل سے ہر غم کو دور کروں گا۔

اس کی خواہش تھی کہ وہ یہیں کا ہو رہے اور یہودی علماء کے ساتھ وہ نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرے وہ کافی مدت تک یہاں مقیم رہا۔ اس نے سارے یثرب کو صاف کرایا۔ عالی شان اور شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ مگر امور سلطنت کی وجہ سے اسے واپس جانا پڑا۔ اس نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے چار سو یمنی علماء کو خوبصورت مکان بنوا کر دیے، ان کے نکاح کرائے اور انھیں زندگی کی ساری سہولتیں فراہم کیں۔ ان علماء میں سے ''شامول'' نامی ایک عالم تھا جسے بہت خوبصورت مکان بنوا کر دیا اور اس کی گذر بسر کے لیے باغات لگوا کر دیے اور اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط بھی دیا جس پر اپنی مہر لگا کر بادشاہ نے اس خط کو ایک صندوقچے میں مقفل کر کے چابی شامول کے حوالے کر دی اور اسے سخت تاکید کی کہ اگر اسے نبیؑ محترم کا زمانہ نصیب ہو اور آپ کا دیدار پُر نور ہو تو یہ خط بصد احترام پیش کر دینا اور اگر تمھیں یہ سعادت نصیب نہ ہو سکے تو اپنی اولاد کو تاکید کر دینا حتیٰ کہ نسلاً بعد نسل وصیت کا یہ سلسلہ جاری رکھے یہاں تک کہ وہ روزِ سعید آ جائے جب وہ پیغمبر و رہبر کامل دنیا جہان میں تشریف لے آئیں۔''

تبع الحمیری کا خط بخدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

''یہ خط حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب جو حضرت عبداللہ کے بیٹے خاتم النبیین ہیں اور رسول رب العالمین ہیں۔ تبع بن وردع کی جانب سے۔ اما بعد۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ پر اور آپ کی کتاب پر ایمان لایا۔ جو اللہ نے آپ پر نازل کی۔ آپ کے دین پر اور آپ کی سنت پر بھی ایمان لایا۔ آپ کے رب پر ایمان لایا۔ جو تمام جہانوں اور تمام چیزوں کا رب ہے اور مالک ہے۔ میں ایمان لایا آپ کے رب کی طرف سے۔ ایمان اور اسلام کی جو فضیلتیں نازل ہوئیں میں نے انھیں قبول کیا۔ اگر میں نے آپ کو پایا تو

میں نے نعمت حاصل کرلی اور اگر نہ پاسکا تو آپؐ میرے لیے قیامت کے دن شفاعت فرما دیجیے۔ اس لیے کہ میں آپ کی اوّلین امت میں سے ہوں۔ لِلّٰہ اُس دن مجھے فراموش نہ کیجیے۔ میں نے آپ کی اتباع آپ کی تشریف آوری اور آپ کی بعثت سے پہلے کی ہے۔ میں آپ کی ملت اور آپ کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر قائم ہوں۔'' ملک تبع نے بطور خاص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے الگ سے ایک مکان بنایا تھا کہ جب نبی آخرالزماں یہاں ہجرت فرمائیں تو اسی مکاں میں قیام فرمائیں۔ یہ خط نسلاً بعد نسل حضرت ابوایوبؓ انصاری کے پاس پہنچا۔ حضرت ابوایوبؓ انصاری شامول کی اکیسویں پشت میں تھے۔ [1] جب یہ خط محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا اور آپؐ اس خط کے مضمون سے مطلع ہوئے تو آپؐ نے زبان مبارک سے تین مرتبہ فرمایا:

''مرحبا یا اخ الصالح''

انصار کے جداعلیٰ مدینہ میں

یمن کے ملک میں کوئی دائمی دریا نہیں۔ پانی پہاڑوں سے بہہ کر ریگستانوں میں خشک اور ضائع ہو جاتا ہے۔ زراعت کے کام میں نہیں آتا۔ سبا مناسب ومختلف موقعوں پر پہاڑوں اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے ''بند'' باندھتے تھے کہ پانی رک جائے اور ضرورت وزراعت کے کام میں آئے۔ سبا کی سلطنت میں اس طرح کے سیکڑوں ''بند'' تھے ان میں سب سے زیادہ مشہور ''سد مارب'' ہے جو اُن کے دارالحکومت مارب میں واقع تھا۔ یہ بند اندازاً ایک سو پچاس فٹ لمبی اور پچاس فٹ چوڑی ایک دیوار ہے۔ اس سد میں اوپر، نیچے بہت سی کھڑکیاں تھیں جو حسب ضرورت کھولی اور بند کی جاسکتی تھیں، سد کے دائیں، بائیں مشرق ومغرب میں دو بڑے بڑے دروازے تھے جن سے پانی تقسیم ہو کر چپ وراست دونوں جانب اس ریگستانی اور شور ملک کے اندر تین سو مربع میں سینکڑوں کوس تک بہشت زار، تیار ہوگئی تھی ـــــ جس میں قسم قسم کے میوہ دار اور خوشبودار بلند درختوں کے گنجان جنگل تھے، قرآن کریم نے سورۂ سبا میں ''جنتن عن یمین و شمال '' کہہ کر

---

[1] سیرۃ المصطفیٰ، ص ۴۰۸، جلد ۱، دارالکتاب دیوبند، ۱۳۵۸ھ، زرقانی، ص ۳۵۹، جلد ۱

انھیں باغوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور وہب سے بھی یہ روایت ہے کہ ''سد مارب'' ملکہ بلقیس نے بنوایا تھا۔ قوم سبا زمانہ دراز تک عیش وعشرت کے ساتھ خدا کی عبادت گذاری میں مشغول رہے مگر جب انھوں نے کفرانِ نعمت کیا تو ان پر سیلاب کا عذاب طاری کردیا اور اہل سبا کے دنیا میں صرف افسانے ہی رہ گئے ـــــ ایک روایت قتادہ اور عکرمہ سے ہے اور اکثر مورخین نے اسی روایت کو قابل اعتماد سمجھا ہے کہ عمرو بن عامر اور ان کے بھائی عمران بن عامر خود بھی کاہن تھے اور ان کے یہاں ایک عورت تھی جس کا نام طریفہ تھا۔ یہ عورت علم کہانت میں کمال رکھتی تھی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ سد مارب ٹوٹ کر سیلاب عظیم آنے والا ہے تو یہ خاندان اپنی کل جائداد کسی حیلہ سے فروخت کر کے مختلف جگہوں میں چلے گئے۔ ثعلبہ بن عمرو عامر ماء السماء حجاز کی طرف متوجہ ہوا[1]۔ اور مع اہل وعیال ذی وقار اور ثعلبہ کے درمیان ٹھہر گیا۔ جب کچھ عرصہ بعد اس کی اولاد جوان ہوئی اور حالت درست ہوگئی تو مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ مدینہ منورہ میں یہودی قبیلے پہلے سے ہی متفرق طور پر آباد تھے۔ ثعلبہ نے مدینہ منورہ کی طرف متوجہ ہوکر وہیں مستقل قیام کیا اور جب وہاں رہتے رہتے قوت وشوکت حاصل ہوگئی تو انھوں نے یہود کو خاص شہر مدینہ سے نکال دیا۔ وہاں اپنے مکانات بنائے، باغات لگائے اور یہ بستی خالص ثعلبہ اور صرف اس کی اولاد کی ہوگئی۔ ثعلبہ کے بیٹے حارثہ ہوئے اور حارثہ کے دو بیٹے اوس اور خزرج ہوئے۔ تمام انصار مدینہ انھیں دونوں کی اولاد ہیں۔ عمرو بن عامر ماء السماء کے چار بیٹے تھے ثعلبہ تو یہاں مدینہ منورہ میں بس گئے اور دوسرے بیٹے حارثہ مکہ مکرمہ چلے گئے۔ وہاں پہلے سے ایک قوم جرہم آباد تھی۔ یہ قوم سرکشی اور گناہوں میں پوری دھنس گئی تو بیت اللہ کی تعظیم وحرمت ان کے دلوں سے نکل گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر حارثہ کو مسلط کردیا۔ قوم جرہم جنگ میں ہار کر مکہ معظّمہ سے خارج ہوگئی اور آخر کار ان کی نسل منقطع ہوگئی اور آج دنیا ان کے وجود سے پاک وصاف ہے۔ مکہ مکرمہ میں حارثہ کی اولاد قوم خزاعہ کے نام سے موسوم ومشہور ہوئی ـــــ ثعلبہ کا تیسرا بھائی عمران بن عمرو سب سے جدا ہوکر عمان کی طرف چلا

[1] اشاعت الاسلام، ص ۲۵۱، مولانا حبیب الرحمٰن، ناظم دار العلوم دیوبند، ۱۳۵۱ھ

گیا۔ وہاں پہلے طسم اور جدلس آباد تھے۔ لیکن ان کی نسل منقطع ہو چکی تھی۔ عمران نے عمان کو وطن بنالیا اور وہ ازدعمان کے نام سے مشہور ہوئے ــــــ ثعلبہ کا چوتھا بھائی جفنہ بن عمرو ملک شام کی طرف چلا گیا۔ اور وہاں جا کر ملک شام کے مالک بن گئے اور یہی جفنہ جبلہ ابن الایہم کا جدامجد ہے۔ سیل عرم کے ٹوٹنے سے پہلے اور بہت سے قبیلے اسی طرح جگہ بہ جگہ آباد ہو گئے۔ قحطانی یمنی سلسلہ کے قبائل میں سب سے زیادہ معزز قبیلہ انصار کا مانا جاتا ہے اور ان میں بھی حضرت ابوایوب کا خاندان سب سے مکرم ومحترم ہے کیونکہ حضرت ابوایوب کو میزبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ [1] ایک ہزار سال پہلے جس شہر کا نام یثرب تھا اب اُس کو مدینہ کہا جاتا ہے۔ سب لوگ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک نورانی شخصیت کا استقبال کر رہے ہیں ہر آدمی وارفتگی کے عالم میں اُن کے آگے بچھا جاتا ہے اور ہر کسی کی خواہش ہے کہ مہمان محترم اسی کے گھر تشریف فرما ہوں ہر کوئی بڑھ چڑھ کر اس کوشش اور جستجو میں تھا کہ اونٹنی کی مہار تھام لے اور مہمان گرامی کو اپنے گھر لے جائے کہ اچانک برتر شخصیت لب کشا ہوئی کہ ''اونٹنی کو چھوڑ دو یہ اللہ کی طرف سے معمور ہے۔'' اونٹنی ایک گھر کے سامنے آ کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنی گردن زمین پر ڈال دیتی ہے۔ مہمانِ محترم اونٹنی سے اترتے ہیں اور اپنا سازوسامان اُتارنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ ایک شخص سامان اتارنے لگتا ہے تو کچھ لوگ جرأت کر کے عرض کرتے ہیں حضور! سامان یہیں رہنے دیں اور آپ ہمارے گھر تشریف لے چلیں۔ آپؐ نے فرمایا ''مرد اپنے سامان کے ساتھ ہوتا ہے'' پھر آپ میزبان کے ساتھ تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ مکان ابوایوبؓ انصای کا ہے۔ ہر فرد حیران تھا کہ آخر اونٹنی ان کے مکان کے سامنے ہی کیوں کر بیٹھ گئی۔ دراصل یہ وہی مکان تھا جسے شاہ تبع والیٔ یمن نے محض اسی غرض سے تعمیر کرایا تھا کہ جب نبی آخرالزماں ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائیں تو اسی مکان میں آ کر اتریں اور قیام فرمائیں۔ چنانچہ دنیا میں سب سے پہلے عاشق رسولؐ کی سچی التجا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اونٹنی اسی مکان پر آ کر بیٹھ گئی گویا آپؐ اپنے ہی مکان میں آ کر تشریف فرما ہوئے تھے اور حضرت ابوایوبؓ انصاری کا قیام تو اس مکان میں فقط آپؐ کی تشریف آوری

---

[1] اشاعت الاسلام، ص ۲۶۲، مولانا حبیب الرحمٰن، ناظم دارالعلوم دیوبند، ۱۳۵۱ھ

کے انتظار میں تھا۔ تاہم یہ سعادت حضرت ابوایوبؓ انصاری کو نصیب ہوئی کہ رہتی دنیا تک آپ میزبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مشہور رہیں گے۔ اگرچہ یہ خوش نصیبی آپ کے اجداد میں سے ''عاشق رسول'' شاہ تبع کے عشق رسول کا صدقہ ہے۔

سیدنا خالد ابوایوب انصاریؓ

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ آپ کی احادیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ کثرت سے احادیث آپ سے مروی ہیں۔ حضور سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تمام غزوات میں شریک ومعاون رہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جس وقت عراق کو جہاد کے لیے تشریف لے گئے تو آپ کو مدینہ منورہ میں اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ لیکن آپ کو جہاد سے علاحدہ رہنے کی تاب نہ ہوئی۔ عراق پہنچے اور حضرت علیؓ کے ساتھ قتالِ خوارج میں شریک ہوئے۔ حضور سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو پہلے مکان ابوایوب انصاریؓ کا تھا۔ جس میں دوجہان کے بادشاہ نے نزول اجلال فرمایا۔ سچ یہ ہے کہ اُس روز دنیا میں ابوایوبؓ انصاری سے زیادہ کوئی خوش قسمت نہیں تھا۔ سبحان اللہ کیا وقت تھا اور کیسے فضل ورحمت کا سال ہوگا جب کہ حضور کی رونق افروزی کی خوشی میں خاندانِ انصار کی لڑکیاں فرطِ مسرت اور روحی فداہ کے خیر مقدم میں دف بجاتی ہوئیں فدایانہ انداز سے۔

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِيْ نَجَّار   يَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِنْ جَار

ہم خاندان بنی نجار کی لڑکیاں ہیں جن کے کیا ہی پیارے محمدؐ ہمسایہ ہیں۔

کا ترانہ زبان ذوق وشوق سے ادا کر رہی تھیں۔ اس محبت واخلاق کا صلہ یہ تھا کہ ابو ایوبؓ اور ان کے خاندان والوں نے انصارِ خدا ورسولؐ ہونے کا لقب حاصل کیا۔ شفیع عاصیاں کے موردِ عنایاتِ خاص ہوئے۔ اس روز سے فلاحِ دارین ان کا نقدِ وقت ہوگیا۔ حضرات انصار کی فضیلت کا یہاں سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ ابوایوبؓ نے حضورؐ کی ریشِ مبارک سے کچھ بال لیے تھے۔ جس پر حضورؐ نے فرمایا تھا: ''لَمْ يُصِبْكَ السُّوءَ يَا اَبَا اَيُّوْبَ'' ''اے ابوایوب تجھے کوئی برائی نہ پہنچے گی۔ اور دوسری

روایت میں وارد ہے کہ حضورؐ نے آپ کی اولاد کے واسطے بھی دعا فرمائی کہ اے خدا ابوایوب کو فراغت دے ان کو محروم نہ رکھ۔ الٰہی ان کے گروہِ اہل سے باقی رکھ اپنی زمین میں اس دن تک کہ حشر کیے جائیں۔ الٰہی ان کی اولاد میں علم پیدا فرما اور علم میں زیادتی فرما۔ اس دن تک کہ وہ تجھ سے ملیں۔ الٰہی اس گروہ میں علم اور بے پروائی اور فقر دے۔ اے خدا ان کی اولاد میں عبادت کرنے والا پیدا کر۔ پھر آپ نے یہ دعا تعلیم فرمائی: "اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ اِلیٰ بِغَیْرِ حِسَابٍ کہ صبح شام پڑھا کریں۔ اس دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد کو بڑے بڑے مدارج سے سرفراز فرمایا۔ ملکِ شام، ہرات، سندھ اور ہند میں کثرت سے آپ کی اولاد موجود ہے۔ اور ہر جگہ بڑے بڑے "قابل" آپ کی اولاد میں ہوتے آئے ہیں حضرت ابوایوبؓ خلافتِ معاویہ میں ہمراہِ لشکر قسطنطنیہ گئے اور ۹۲ھ میں وہیں انتقال ہوا۔ استنبول میں "جامع ایوبی" آپ کے نام سے مشہور اور آپ کا مزار زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔ تُرک بڑی عظمت کرتے ہیں۔ اور قحط و پریشانی میں آپ کے وسیلے سے دعا کر کے کامیاب ہوتے ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے: سیدنا خالد ابوایوب انصاری بن زید بن کُلیب بن ثعلبہ بن عبدعوف بن غنم بن مالک بن النجار بن عدی بن عمر بن مالک بن تیم اللہ بن ثعلبہ بن عمرو بن خزرج بن حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو مزیقیا بن عامر بن حارثہ بن بہلول بن ثعلبہ بن مازن بن اُزد بن غوث بن نبت بن مالک بن زید بن کہلان بن سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان بن عابر (حضرت ہود علیہ السلام)

سدِ مارب یا سیلِ عرم

قوم سبا اور شہر مارب کے عجائب حالات پر یقین کر لینا عقل انسانی سے بعید تھا مگر قرآن پاک میں سورۂ سبا میں اللہ تعالیٰ نے ان کے واقعات کو ایک خاص شان اور اہتمام سے بیان فرمایا ہے اس لیے اِن کے حالات پر یقین کرنے میں کوئی تأمل نہیں۔ ملک یمن کی راجدھانی صنعا شہر سے تین منزل کے فاصلہ پر ایک شہر مارب تھا۔ جس میں قوم سبا آباد تھی۔ دو پہاڑوں کے درمیان شہر بسا ہوا تھا۔ پہاڑوں کے درمیان اور اوپر سے بارش کا سیلاب آتا تھا۔ یہ شہر ہمیشہ سیلابوں کی زد پہ رہتا تھا۔ اس شہر کے بادشاہوں میں سے ملکہ

بلقیس نے دو پہاڑوں کے دَرّہ کو جس کی لمبائی تین میل تھی اور چوڑائی بھی تین میل۔ بڑی بڑی چٹانوں کو لوہے اور سیسے سے جوڑ کر ایک آہنی سد بنا دیا۔ تا کہ اس مضبوط ڈیم میں پانی کا اثر بالکل نہ ہو سکے۔ اس باندھ نے تمام سیلابوں کو روک کر ایک عظیم الشان پانی کا ذخیرہ بنا دیا۔ اس باندھ میں پانی کے نکاس کے اوپر نیچے تین دروازے رکھے گئے کہ مخصوص انتظام کے تحت شہر کے لوگ اور ان کی زمین و باغات کی آبپاشی کے کام آئے۔ باندھ کے نیچے ایک بہت بڑی حوض بنائی گئی تھی۔ جس میں بارہ خاندانوں کے لیے بارہ راستے بنا کر بارہ نہریں شہر کے مختلف اطراف میں پہنچائی تھیں۔ مگر نہروں اور کھیتوں میں پانی آنِ واحد میں یکساں پہنچ جائے انجینئرنگ کا حیرت انگیز طریقہ استعمال کیا گیا تھا۔ شہر کے دائیں، بائیں دونوں کناروں پر باغات لگائے گئے تھے دورویہ اور قریب قریب، جن میں نہریں جاری تھیں۔ ایسے باغات لاتعداد تھے۔ اس باندھ کے پانی نے تین سو مربع میل میں کشت زار تیار کر دی تھی۔ اسی کو قرآن نے جَنَّتَانِ عَن يَّمِيْنٍ وَشِمَالٍ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ مشرق ومغرب کو خالی اس وجہ سے چھوڑا گیا تھا کہ دھوپ آتی رہے۔ ٹھنڈک اور مرطوب ہواؤں سے شہر میں بیماریاں نہ پھیل پائیں۔ ائمۂ سلف قتادہ وغیرہم کے بیان کے مطابق اگر ایک عورت اپنے سر پر خالی ٹوکری لے کر چلتی تو درختوں سے ٹوٹ کر آپ ہی آپ گرنے والے پھلوں سے خود بخود بھر جاتی۔ اس کو ہاتھ بھی نہ لگانا پڑتا۔ قوم سبا پر انعامات خداوندی اس قدر تھے کہ احاطہ مشکل ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ دورانِ سفر برابر کے فاصلے اور قرینہ سے سرسبز دیہات کا سلسلہ قائم تھا گویا صحیح طور سے ناپ تول کر ایسی منزلیں بنادی تھیں جن میں مسافروں کی راحت و آرام کو سرائیں اور ہوٹل موجود تھے۔ صبح سے دوپہر تک مسافر قیام کرنا چاہے تو اس کو اتنی مسافت پر ایک اچھی آبادی اور پُر فضا بستی ملتی تھی جس میں ہر قسم کی ضروریات زندگی اور سامان آسائش مہیا ہوتے تھے۔ راستے مامون اور بے خوف نہ درندے کا ڈر اور نہ دشمن کا خدشہ ہر جگہ کھانے پینے اور ٹھہرنے کا بہتر سے بہتر انتظام۔ ایک شخص بلا کسی قسم کا توشہ لیے بغیر، تن تنہا بے چون وچرا مہینوں سفر کر سکتا تھا۔ پُرانے زمانے میں ملک یمن سرسبزی و شادابی میں بڑے بڑے متمدن ملکوں سے بڑھا ہوا تھا۔ اس میں

خوبصورت نہایت آراستہ وپیراستہ عالی شان مکانات تھے۔ صنعا شہر ملک یمن کا بے مثال خوشنما پُر فضا مقام تھا۔ آب وہوا صحت بخش اور خوشگوار تھی۔ سردی وگرمی کے باوجود دونوں موسم معتدل تھے۔ یہاں کے باشندے ہر طرح عیش وعشرت میں گزر بسر کرتے تھے۔ شہر مارب کو قرآن پاک میں بلدۂ طیبہ یعنی پاک شہر کہا گیا ہے کیونکہ وہاں کی آب وہوا روح پرور اور صحت افزا تھی کہ کوئی موذی جانور سانپ، بچھو، کھٹمل، پسّو اس میں پیدا نہ ہوتے تھے بلکہ باہر سے آنے والے مسافروں کے کپڑوں میں اگر جوئیں یا دوسرے حشرات الارض ہوتے تھے تو یہاں آتے ہی مرجاتے تھے۔ باشندوں کو نہ کبھی کوئی مرض پیش آتا تھا نہ کسی قسم کا سوئے ہضم ہوتا تھا اور نہ ذائقے خراب ہوتے تھے۔ مدتوں یہ قوم اطاعت خداوندی کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہی۔ آخر ہر طرح کی فراخی فراوانی میں مست ہوکر ناشکری اور سرکشی کرنے لگے اور زبردست معاصی کے مرتکب ہونے لگے۔ حضرت ابن عباسؓ، وہب بن منبہ، قتادہ، ضحاک وغیرہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جو باندھ ان کی حفاظت وخوشحالی کا ذریعہ تھا اسی کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آفت ومصیبت بنادیا جب اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو سزا دینے کے لیے سد مارب یعنی سیل عرم کو توڑ کر سیلاب سے تباہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو اس پانی کے عظیم الشان باندھ پر اندھے چوہے مسلط کردیے جنھوں نے اس کی بنیاد کو کھوکھلا اور کمزور کردیا۔ جب بارش کا وقت آیا تو پانی کے دباؤ نے باندھ کو توڑ دیا اور جمع شدہ پانی پوری وادی میں پھیل گیا اور پورا شہر، باغات اور مکانات غرق آب ہوکر تباہ ہوگئے۔ اور دوطرف پہاڑوں پر جو باغات تھے ان کا پانی خشک کردیا گیا۔ تاریخی روایات میں یہ بھی ہے کہ کچھ دوراندیش ہوشیار لوگ چوہوں کو دیکھتے ہی یہ جگہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ اور دوسری طرف چلے جانے کا قصد کرنے لگے اور بتدریج انتظام کرکے نکل گئے۔ وہب بن منبہ کی روایت میں ہے کہ ان لوگوں کی کتابوں میں یہ بات لکھی چلی آتی تھی کہ اس باندھ کی خرابی اور تباہی چوہوں کے ذریعے ہوگی۔

قوم سبا کی دولت وثروت کے بارہ میں اسٹرابو لکھتا ہے کہ یہ سونے چاندی کے برتن استعمال کرتے تھے۔ اور ان کے مکانوں کی چھتوں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت،

سونے، چاندی اور جواہر کا کام بنا ہوا تھا۔ آرٹی میڈ روس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے تھے اور جلانے کی لکڑیوں کے بجائے دار چینی، صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ ان کے شہر نہایت خوبصورت، دلربا آراستہ تھے اور ان کے محلات اور قلعہ جات موجود تھے، قصر غمدان یمن کی بہترین صنعت وانجینئری کا بے مثل نمونہ تھا۔ تاریخ نے پہلی بار بلند پہاڑی پر آسمان کو چھوتی عمارت دیکھی تھی۔ اس کی بیس منزلیں تھیں اور ہر منزل چھتیس فٹ بلند تھی۔ اس کی اوپر والی چھت دلدار موٹے آئینوں سے بنائی تھی یہاں کھمبوں والی عمارتوں کا رواج تھا۔ یہاں لاتعداد حسین عمارتیں تھیں۔[1]

انصار عرب، ہندوستان میں

۸۰۰ قبل مسیح سے ہی عرب اور ہندوستان میں بہترین دوستانہ اور تجارتی تعلقات قائم تھے۔ مصنف ارض القرآن کے مطابق یمن ایک طرف سواحل ہند کے مقابل ہے تو دوسری طرف سواحل افریقہ کے۔ سونا بیش قیمت پتھر، مسالہ، خوشبوئیں، ہاتھی دانت۔ یہ چیزیں حبش اور ہندوستان سے ٹھیک یمن آکر اترتی تھیں۔ علاوہ ازیں ہند کے ساحلی علاقوں میں عرب تاجر وقتاً فوقتاً سرندیپ، چین، چیمور، سوپارہ، سندان، تھانہ بھڑوچ اور کھمبات وغیرہ آتے رہتے تھے۔ بزرگ بن شہریار رامہرمزی کی تصریح کے مطابق عہد رسالت میں ہی ایک وفد سرندیپ سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ مگر چند رکاوٹوں کی وجہ سے عہد فاروقی کی ابتدا میں وہاں پہنچا۔ اور براہ راست اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ البیرونی کے بیان کے مطابق کوکن کا مرکزی شہر تھانہ تھا۔ جہاں راجہ بلہرا (وبھی رائے) کی طرف سے اس کے گماشتے حکومت کرتے تھے۔ اس سے قریب ہی چیمور یعنی بمبئی میں اس کا نائب حکومت چلاتا تھا۔ بلاد چیمور کا لفظ تھانہ، سوپارہ اور سندان وغیرہ کو شامل تھا۔ ہندوستان میں بلاد چیمور ہی مسلمان عربوں کا سب سے پہلا علاقہ یوں مانا جاتا ہے کہ عہد فاروقی میں مجاہدین اسلام کی ایک غیر سرکاری رضا کارانہ جماعت نے تھانہ میں پہلا قدم رکھا۔ عام طور سے ہندوستان میں عربوں کی آمد کا

---

[1] حاشیہ قرآن پاک، ص ۵۷۳، شاہ فہد قرآن شریف پرنٹنگ کمپلیکس مدینہ منورہ ۱۹۹۳ء۔

تصور فاتح سندھ محمد بن قاسم ثقفی سے وابستہ رہا ہے۔ مگر اس سے بہت پہلے ہند کے ساتھ عربوں کے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ علامہ بلاذری نے فتوح البلدان باب السندھ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ۱۵ھ مطابق ۶۳۷ء میں حضرت عثمان بن العاص ثقفی کو بحرین کا حاکم مقرر فرمایا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے بھائی حکم بن العاص کو بحرین بھیجا اور خود عمان پہنچ کر تھانہ کی طرف ایک فوجی مہم روانہ کی اور جب لشکر واپس آیا تو حضرت عثمانؓ نے اسی بھائی کو بھڑوچ روانہ کیا اور اپنے دوسرے بھائی مغیرہ بن العاص کو دے بل (کراچی) کی طرف روانہ کیا۔ جہاں ان کو خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ اسی دوران حضرت عثمانؓ نے اپنے ایک بھائی کو سندھ کی مہم پر روانہ کیا۔ چونکہ حضرت عمر فاروقؓ نے مکران (بلوچستان) پر قبضہ ہونے کے بعد فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ اس لیے فوج کے اکثر حضرات یہیں رک گئے۔ اکثر مجاہدین اپنے ساتھ اپنے اہل وعیال رکھتے تھے چنانچہ یہیں آباد ہوکر تبلیغ اسلام میں مصروف ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہی مہلب بن صخرہ انصاری نے باقاعدہ سندھ پر فوج کشی کی۔ جو مرو کے اطراف سے کابل اور زابلستان ہوتا ہوا ہندوستان آیا اور ملتان تک یلغار کی مگر ان کو یہاں سے خلیفہ کے حکم پر حکم بن عمر کی مدد کے لیے ترکستان جانا پڑا۔ جہاں انھوں نے بڑی فتوحات حاصل کیں۔ وہاں سے فارغ ہوکر پھر ہندوستان میں آکر اسلامی تبلیغ کی خدمت میں منہمک ہو گئے۔ ان کے دائرۂ اثر میں مغربی کوہستان اور ان کے میدان تھے جو بہت جلد حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ لہٰذا اخ سے کوہاٹ اور شمال مغربی گوشے تک انھیں کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ان اطراف میں اسلام پھیلا۔ مہلب بن صخرہ انصاری کثیر الاولاد تھے۔ وفات کے وقت تین سو بیٹے، پوتے اور پڑوتے چھوڑے جن سے بہت سے خاندان اور قبیلے ہندوستان میں پھیلے[1]

۵۹ھ میں کچھ عرب، حارث محمد علافی کے ساتھ اسلامی ملکوں سے بغاوت کر کے بھاگ آئے تھے۔ اور سندھ میں راجہ داہر کے زیر حکومت ان کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ تاریخ۔ سندھ۔ تذکرۃ الانصار، شمس الحق انصاری۔ فتح محمد خورشید، ص ۶۱

تھے۔ محمد علافی کے ساتھ اس کے خاندان کے پانچ سو لوگ تھے۔[1] مؤرخ تاریخ فرشتہ لکھتا ہے کہ وقتاً فوقتاً بہت سے اہل عرب و مصر یہاں بغرض تجارت آتے رہے یا جہاد کی غرض سے آئے تھے۔ ہندوستان میں عربوں کی آمد و موجودگی اور یہیں پر سکونت اختیار کرنے کے بارے میں عربی، اردو، ہندی تاریخوں کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ محمد بن قاسم پچیس ہزار فوج کے ساتھ سندھ آیا تھا۔ جون ۷۱۲ء میں راجہ داہر ''ریوا'' کے مقام پر مارا گیا۔ اور عرب مسلمان یکے بعد دیگرے برہمن آباد، ملتان، نیرون، ارور شہر، بدیل، دھلیلہ، سیسم، دَےبُل (کراچی) وغیرہ کو فتح کرتے گئے۔ اور ان جگہوں کے انتظام وانصرام کے لیے نہایت مدبر، دانشور، عالم، دلیر و شجاع عربوں کو متعین کیا۔[2] محمد بن قاسم کی فوج کے عرب سپہ سالاروں میں سلیمان بن نبہان، بنانہ بن حنظلہ، مصعب بن عمیر، محمد ثقفی، منصور بن حاتم، زکوان بن علوان یکری، حبیب بن مسلم وغیرہ نہایت جری اور ماہرین حرب حضرات کے نام شامل ہیں۔[3] اور محمد ذیلی بصری، حمیم شامی بن سامہ، وداع بن حمید النجدی، سلیمان بن ازدی، حمید بن وداع، عبدالقیس، رواح بن اسد، موسیٰ بن یعقوب بن شیبان بن عمان ثقفی، ابوفراسی سامی، صابر یشکری، عبدالملک بن خزاعی محرم بن خلّہ، علوفہ بن عبدالرحمٰن وغیرہ حضرات کو شہروں کی حفاظت وانتظام کے لیے مقرر کیا تاکہ قوانین کے مطابق حکومت کریں اور امن وامان قائم رکھیں۔ ان میں سے بیشتر سپہ سالار اور ان کے ہمراہی سپاہی ہندوستان میں ہی مقیم ہو گئے۔[4] زکوان بن علوان یکری اور قیس بن ثعلبہ کے اہل وعیال بھی ان کے ہمراہ تھے۔[5] خاص ملتان کی حکومت عکرمہ بن ریحان شامی کے سپرد کی گئی۔ اور شہر ملتان کا حاکم داؤد بن نظر بن ولید غسانی کو بنایا گیا۔ فتح کراچی کے بعد سب سے پہلے ایک مسجد کی تعمیر کی گئی۔ اور چار ہزار گھر یہاں عربوں کے آباد کیے گئے۔[6] حکم بن عوانہ کلبی حاکمِ سندھ نے سندھ کے مشرق میں ایک شہر ''محفوظہ'' نام کا آباد کیا۔ محمد بن قاسم

---

[1] تاریخ سندھ ۲۵ تا ۳۹، ابوظفر ندوی معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء
[2] تاریخ سندھ ص ۶۷
[3] بلاذری ص ۴۳۸
[4] تاریخ سندھ ص ۶۴ و ص ۶۵ و ص ۷۷
[5] ۵۴ تا ۱۱
[6] چچ نامہ ص ۹۴

کے بیٹے عمرو نے ایک شہر بسایا جس کا نام "منصورہ" رکھا۔ ۶۹۷ء میں ایک عرب سردار فرید ہاشمی نے ساپورہ (پنجاب) کو فتح کیا اور اپنے نام پر ایک شہر "فرید آباد" بسایا۔ فرید آباد اور گردگاؤں میں اپنے خاندانیوں اور ہزاروں انصار عربوں کو یہاں آباد کیا[1] سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ عربوں نے سندھ کا علاقہ فتح کرنے کے بعد وہاں اپنی نو آبادیاں قائم کیں۔ قریش، کلیب، تمیم، اسد اور یمن و حجاز کے بہت سے خاندان اور قبیلے مختلف شہروں میں آباد ہو گئے[2] قلعۂ اکلندہ، برہما پور، اجہاد اور کرور سیوستان پر بالترتیب حاکم مقرر کیے۔ ان میں عتبہ بن سلمیٰ تمیمی، عبدالملک تمیمی، احمد بن خزیمہ بن عتبہ مدنی انصاری، خالد انصاری، مسعود تمیمی وغیرہ انصار کے نام نامی شامل ہیں[3]۔

سندھ کے راجہ داہر کے قتل کے بعد انصار عرب یہاں کے فرمانروا ہوئے[4] جب محمود غزنوی نے ہند پر حملہ کیا اور اس کے والد سبکتگین نے یہاں مبلغین بھیجے تو نہ صرف دیگر قبائل بلکہ بہت سے لوگ خاندان حضرت ابوایوب انصاری اور خاندان مہلب بن صفرہ انصاری ہند میں تشریف لائے۔ بذمرۂ مجاہدین جہاد میں شامل ہو گئے اور مختلف اطراف ہند و پنجاب میں مقیم ہو گئے[5,6]۔ پنجاب کے شیخ صاحبان قریباً تمام انصاریوں کی اولاد ہیں۔ پنجاب کی سرحدوں پر اور تمام پرانے شہروں میں انصار کی بڑی تعداد ملتی ہے مثلاً پشاور، کوہاٹ، ملتان، چنیوٹ، منٹگمری، شاہی وال، سنگھرہ، بھیرہ، خوشاب، ٹکسالا، جالندھر، انبالہ، پانی پت، کرنال، شاہ آباد، شیر گڑھ، حجرہ، دیپالپور، وغیرہ[7]۔ تاریخی شہادتوں نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری کی اولاد مختلف زمانوں اور مختلف ریاستوں میں سرزمین ہند میں وارد ہوئی۔ جب عرب مجاہدین کی فوج محمد بن قاسم کی سپہ سالاری میں سندھ پر حملہ آور ہوئی تھی تو محمد بن قاسم، حضرت ابوایوب کے پڑپوتے محمد یوسف انصاری کو بھی ساتھ لائے تھے کیونکہ یہ دونوں گہرے دوست تھے، محمد یوسف انصاری بمعہ اہل و عیال آئے تھے اور جس قدر فتوحات محمد بن قاسم کو ہندوستان میں ہوئیں

---

[1] ٹاڈ راجستھان ۴۷ [2] عرب ہند کے تعلقات، ص ۳۰۳ [3] و تذکرۃ الانصار ۳۶
[4] ٹاڈ راجستھان ص ۱۵۴۷ [5] تذکرہ انصار، ص ۱۸۳ [6] ٹاڈ راجستھان، ص ۴۷۴ [7] تذکرۃ الانصار ۲۸۳

وہ زیادہ تر اسی محمد یوسف کی بہادری اور شجاعت کا صدقہ تھا۔ محمد بن قاسم کی معزولی کے بعد انصار کا یہ خاندان ہند ہی میں قیام پذیر ہوا[1]۔

محمود غزنوی کے چھٹے حملے کے وقت بھی خاندان حضرت ابوایوب انصاری اور کئی بزرگ بغرض جہاد معہ اہل وعیال فوج کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے[2]۔ شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات کے وقت بھی انصار اس کی فوج میں شامل ہو کر جہاد فی سبیل اللہ کرتے رہے۔ اور جب ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا مستقل قیام ہوا تو بہت سے انصار خاندان بھٹنڈہ میں آباد ہو گئے[3]۔

ہندوستان میں آزاد اور خود مختار پانچ عرب حکومتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

(۱) حکومت ماہانیہ، سنجان (ہند) ۱۹۸ھ سے ۲۲۷ھ تک

(۲) حکومت ہباریہ، منصورہ (سندھ) ۲۱۷ھ سے ۴۱۶ھ تک

(۳) حکومت سامیہ، ملتان (پنجاب بھی شامل) ۲۸۰ھ سے ۳۶۰ھ تک

(۴) حکومت معدانیہ، تیز (مکران) ۳۴۰ھ سے ۴۷۱ھ تک

(۵) حکومت متغلبہ، قصدرا (طوران) ۲۴۰ھ سے ۴۷۱ھ تک[4]

شیخ الاسلام حضرت عبداللہ انصاری حضرت ابوایوب انصاری کے پوتے کے بیٹے ہیں۔ آپ نہایت ذہین وزیرک، عالم بے بدل، مفسر، واعظ، فقیہ وقت، زبردست حافظِ حدیث، مفتی، متقی، روشن ضمیر بزرگ، تھے۔ احنف بن قیس کے ہمراہ عرب سے خراسان تشریف لائے اور شہر ہرات میں قیام پذیر ہوئے۔ یہیں انتقال ہوا اور یہیں آپ کا مزار ہے۔ شاہان کابل سخت مصیبت وناامیدی کی حالت میں اسی مزار پر برکت حاصل کرنے کے لیے پیدل چل کر جاتے ہیں۔ آپ ''پیر ہرات'' کے نام سے مشہور ہیں اور آج تک فیض جاری ہے۔ آپ کا مزار مرجع خاص وعام ہے۔ آپ کثیر الاولاد تھے۔

انصار ہند کے مورث اعلیٰ دراصل آپ ہی ہیں۔ جالندھر، تھانیسر، کیتھل، پانی پت،

۱و۲ تذکرۃ الانصار، ص ۲۸۳ و ص ۳۱۶ ۔ ۳ تذکرۃ الانصار، ص ۳۱۸

۴ ہند میں عرب حکومتیں، ص ۲۱

لکھنؤ، حبیب والہ (بجنور) بلند شہر، کیرانہ (مظفر نگر) انبہٹہ پیر ضلع سہارنپور، گنگوہ شریف ضلع سہارنپور اور دیگر شہروں میں بھی آپ کی اولاد کی کثیر آبادی ملتی ہے۔ نیز ہرات میں ہی حضرت ابوایوب کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے ابومنصور انصاری بھی آباد ہوئے۔ گنگوہ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد آباد ہے۔ اور انبہٹہ پیر میں عبداللہ بن زبیرؓ کی اولاد آباد ہے[1] پیر ہرات حضرت عبداللہ انصاری نے حدیث شریف اور تاریخ اور علم الانساب میں کمال پیدا کیا۔ تفسیر و سیرت اور تصوف کے تو امام تھے، نہایت خوش پوشاک اور باہیبت آدمی تھے۔ ایک مجلس میں اتنی احادیث بیان کر جاتے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ بارہا فرماتے تھے کہ مجھے ہزار ہا حدیثیں اس طرح یاد ہیں کہ جب چاہوں بیان کردوں۔ آپ کی تصانیف میں سے کتاب الاربعین، کتاب الفروق، کتاب منازل السائرین، مناجات اور مناقب امام احمد بن حنبلؒ مشہور کتابیں ہیں ہندوستان میں کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں آپ کی اولاد نہ ہو[2]

گنگوہ

چاند پور گڑھ ضلع گڑھوال کا پنوار گوجر راجہ کنک پال عرف گنگ سہارن پور کی راہ ہوکر اپنے بہت سے گوجر ساتھیوں کے ساتھ بدری ناتھ کی یاترا کو جارہا تھا کہ اس کا گزر گنگوہ کے علاقہ میں ہوا۔ یہ جگہ کوہ مسوری ودہرہ دون کی ترائی کا خوش منظر پُر فضا مقام تھا۔ قسم قسم کے گنجان اونچے اونچے درختوں کا ہجوم، ہریالی سے ہرا بھرا میدان قریب میں بہتا ہوا دریائے جمنا، معتدل آب وہوا۔ وہ بے خود و مخمور ہوکر رہ گیا اور اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ یہاں اپنی قیام گاہ بنائے گا۔ یاترا کی واپسی پر اس نے یہاں اپنے نام کی مناسبت سے ۶۸۸ء میں اپنی برادری کے چند گوجر حضرات کو یہاں ٹھہرا کر گنگوہ کی جگہ کو اس وقت ''کنک پور'' کا نام دیا اور ہفتوں اس گل پوش وادی میں مقیم رہا۔ یہاں کے پُرکشش ماحول نے اس کو بار بار یہاں آنے پر مجبور کیا تو اس نے یہاں ایک قلعہ بنوا کر باقاعدہ اپنی عملداری قائم کی اور مختصر سی ریاست کے تمام لوازمات فراہم کیے۔ مشہور مورخ آر،سی، ولیمس اور

---

[1] تذکرۃ الانصار، ص ۲۱۶   [2] مراۃ الانساب، ص ۱۲۲

مہاراجہ اودے پال سنگھ کی تحقیق یہ ہے کہ راجہ کنک پال نریش گوجر مالوا (گجرات) سے سہارنپور کی راہ ہوکر گڑھوال آئے تھے۔ گنگوہ ضلع سہارنپور نام کا قصبہ انھیں کا بسایا ہوا ہے۔ گڑھوال کی گوجر پٹی کا نام گوجروں کے نام پر ہی ہوا تھا۔ اور کچھ گوجر سہارن پور سے آ کر گڑھوال میں بس گئے۔ [1] پہلی صدی عیسوی سے جیسا کہ بہت ثقہ اور مصدقہ طور سے جنرل کینگھم، کے ایم منشی، ڈاکٹر آر، سی مجمدار گروپ مانتا ہے کہ سہارنپور کا علاقہ اٹھارہویں صدی تک گجراتہ مشہور تھا۔ آٹھویں صدی میں جب کنک پال راجہ سہارنپور کو ہوتے ہوئے گنگا میں نہانے کے لیے گئے تھے اس وقت یہاں کے اردگرد پنوار (لنڈھورا گوجر) چھوکر (ٹملی ضلع دہرہ دون) ھلاس (من نوہرا) منوہرا نام کی راجدھانیوں میں حکومت کرتے تھے۔ [2] ریٹائرکلکٹر و مجسٹریٹ کیپٹن سوروپ سنگھ پنوار لکھتے ہیں کہ میرا خاندان گڑھوال کے پنوار، راجہ کے خاندان سے ہے۔ میرے والد راجکمار چتر شاہ گڑھوال راجہ نریش کرتی شاہ کے بھائی تھے۔ ہمارے بزرگ کنک پال اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مالوا (گجرات) سے ۷۴۵ بکرمی مطابق ۶۸۸ء میں بدری ناتھ آئے تھے یہاں چاند پور گڑھ (چمولی ضلع گڑھوال) کے بھانو پرتاپ کی لڑکی سے شادی ہونے کی وجہ سے یہیں کے ہوکے رہ گئے۔ اور یہاں حکومت کرنے لگے۔ ساٹھ پشتوں تک ان کا راج قائم رہا۔ کنک پال کے بیٹوں پوتوں کے بنائے گئے مندروں پر آج بھی گجرات کے قدیم فنکاری کے نمونے ''آدی ادری'' چاند پور گڑھ ایک کیلومیٹر کی دوری پر اپنی تاریخی صداقت وشہادت کے لیے موجود ہیں۔ یہاں ایک مندر پر چار لائنی دوہا کندہ ہے۔ جس کا ترجمہ ہے کہ یہ راجہ گجرات سے یہاں آکر ۷۴۵ بکرمی میں بسا تھا۔ اور یہ پنوار گوجر ہے اور اس کا نام کنک پال عرف گنگ ہے۔ [3] گنگوہ کے آس پاس یہ بات مشہور ہے کہ یہ راجہ گنگ راجپوت راجہ ہے۔ عوام میں یہ بات دووجہوں سے مشہور ہوئی اوّل یہ کہ ۱۱۱۸ء میں ضلع سہارنپور اور اس کے مضافات پرتھوی راج چوہان کی حکومت میں شامل تھا دوسرے یہ کہ سہارنپور کے قریب مانک

---

[1] گوجر ونش ایوم کال، ص۶۴

[2] حوالہ بالا ۴۳، ملتان سنگھ منڈلانہ وڈاکٹر پدم سنگھ ورما منوہرا ضلع سہارنپور مطبوعہ ۱۹۸۶ء، دہلی ۶

[3] گڑھوال کا اتہاس ہندی، ۱۶۱

ہو ریاست کا راجہ جس کا نام گنگ داس تھا پرتھوی راج چوہان کا چچازاد بھائی تھا۔ اس گنگ
داس کی وجہ سے لوگوں کو مغالطہ ہوا جبکہ راجہ گنگ جس کا نام دراصل کنک پال نریش تھا اور اسی
کی عرفیت گنگ ہے جو گنگوہ کا گوجر نیوار تھا۔[1] کنک پال عرف گنگ نے گنگوہ کو اپنے نام
پر کنک پور کے نام سے بسایا تھا۔ وقت کے نشیب و فراز نے کنک پور کو چھوٹے سے موضع
سے بڑی آبادی میں تبدیل کر دیا۔ یہ قصبہ ۷۴۵ بکرمی مطابق ۶۸۸ء موافق ۲۶ھ میں عالم
وجود میں آیا۔ ۲۰۰۳ء تک اس کو بسے ہوئے تیرہ سو پندرہ (۱۳۱۵) سال ہو چکے ہیں بدلتے
کبھی کنک پور سے کنک پو، کبھی کھناھو کبھی گھنگو
وقت کے ساتھ اس کے نام بھی بدلتے گئے۔ یہ
کبھی گنگو، لوگوں کی زبانوں پر رہا۔[2] فٹ نوٹس آئین اکبری بحوالہ آثار الصنادید ص ۳۰
کھنکھو، کھکھو، کھنکھور، آخرکار گنگوہ مشہور عالم ہوا۔ راجہ کنک پال کی حکومت کا صدر مقام
تو گڑھوال میں چاندپور گڑھ ہی تھا مگر اس کی سلطنت گڑھوال، بنارس، قنوج تک پھیلی ہوئی
تھی۔ گنگوہ اور یہ خطہ اس کے پسندیدہ مقامات میں سے ایک تھا۔ اکثر و بیشتر وہ یہاں قیام
کرتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد میں سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی یہاں موجود
رہا ہے۔ اس خاندان کے ہر فرد کو ''گنگ'' کہا جاتا تھا۔ گویا عرفیت ہر فردِ خاندان پر محیط تھی۔
رہائش کے لیے قلعہ موجود تھا اور گنگوہ کے چاروں طرف ''شہر پناہ'' اور قلعہ کے چاروں
طرف برج موجود تھے۔ جن میں ہرکارے اور مخبر سپاہی ہمہ وقت نگرانی کے لیے تعینات
تھے۔ شہر پناہ میں چاروں طرف چار دروازے رکھے گئے تھے، جن میں سے تین دروازے
اب تک اچھی حالت میں موجود ہیں اور چوتھے دروازے کے کچھ نشانات ابھی تک قائم
ہیں۔ قلعہ اور آبادی اُس زمانے کے دستور کے مطابق اونچی جگہ پر تھے۔ اب سے پچاس
سال پہلے تک اس قلعہ کی بہت بلند ایک دیوار کا حصہ موجود تھا۔ پہلے جس مقام پر قلعۂ گنگ
تھا اب وہاں میونسپل بورڈ کا دفتر ہے۔
کنک پال کی اولاد میں ایک دلیر، جنگجو راجہ بھیم دیو کا نام ملتا ہے۔ یہ ۱۱۷۵ء میں

---

۱ آرکیولوجیکل سروے رپورٹ حصہ دوم ۱۱۷۹ء (۵۵۷ھ) کننگھم
۲ آئینِ اکبری ص ۲۸، ۱۳۳، مصنفہ ابوالفضل العلامی ناگوری، منشی نولکشور لکھنؤ، ۱۳۱۰ء

گدی پر بیٹھا اور اپنے باپ اجے پال کی طرح اپنی سلطنت کو از سرنو زندہ کیا۔ اس وقت پورا ہندوستان، چوہان، سولنکی، چالوکیے، چاپ، پنوار اور تومرو وغیرہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ آپسی جنگ وجدل کا دور دورہ تھا بھیم دیو کو داخلی بغاوتوں کو کچلنے کے علاوہ بیرونی دشمنوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا معزالدین غوری بھی اس کے لیے دردسر بنا ہوا تھا۔ اس لیے راجدھانی سے دور رہتا تھا۔ چنانچہ مارواڑ، جودھپور، قنوج وغیرہ میں اس کے معتمدین خاص حکومت کے انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ گنگوہ میں ۱۱۸۳ء میں اس کا قائم مقام اُلھّن دیو کالڑ کا گنگ دیو یہاں کا راجہ گنگ تھا۔ اور یہاں کے سرخ وسفید کا مالک تھا۔ ۱؎ ۶۸۸ء سے ۱۱۹۲ء تک پانچ سو چار (۵۰۴) سال تک اس قصبے کے بارے میں معتبر ومصدقہ معلومات فراہم نہ ہوسکیں۔ البتہ ۱۱۹۲ء سے کچھ پہلے یہاں پر مسلمان انصار عربوں کی آمدورفت اور مختصر حالات فارسی اور اردو زبان میں تحریر کردہ نجی اور پُرانے کاغذات میں چند انصاریان گنگوہ کے یہاں موجود ہیں۔

انصار عرب، گنگوہ میں

راجہ گنگ ۱۱۸۳ء میں گنگوہ کا حاکم و مالک تھا جو اس وقت پرتھوی راج چوہان کے ماتحت تھا۔ اس کے دربار میں ایک مراثی کا آنا ہوا۔ جو ہندوستان برائے سیر وسیاحت آیا تھا مراثی نے راجہ کو دائیں ہاتھ سے سلام کرنے کی بجائے بائیں ہاتھ سے سلام کیا۔ راجہ اس کی اس خلاف معمول حرکت پر بڑا غضبناک ہوا۔ اور اس سے معلوم کیا کہ تو کون ہے اور کہاں سے آرہا ہے۔ مراثی نے نہایت بے باکانہ انداز میں کہا کہ میں انصاریان باوقار کا مطرب ہوں جو لاہور و بھٹنڈا اور ان کے مضافات میں ہرات سے آکر آباد ہوگئے ہیں۔ راجہ نے سوال کیا کہ الٹے ہاتھ سے سلام کرنے کا کیا سبب ہے؟ مطرب نے جواب دیا کہ میرا دایاں ہاتھ انصاریان محترم کے لیے ہے، اس ہاتھ سے میں غیروں کو سلام نہیں کرتا۔ اہل ہنود کو خاص طور سے میں الٹے ہاتھ سے ہی سلام کرتا ہوں۔ راجہ گنگ نے یہ کلام سن کر نہایت غصہ میں حکم دیا کہ اس مطرب کا دایاں ہاتھ کاٹ دو۔ چنانچہ اسی وقت اس مراثی کا ہاتھ کاٹ دیا

۱؎ گوجر ونش ایوم کال، ص ۲۵۳ تا ۲۵۵

کیا ــــــ دست بریدہ اور زخم خوردہ مطرب یہاں سے فوراً اپس ہوا۔ جوں توں کر کے انصار کی خدمت میں حاضر عرض کیا کہ نابعدار کا ہاتھ آپ کے ہی نام پر قلم کیا گیا ہے اور پورا واقعہ بیان کیا۔ انصاریان حضرات نے برافروختہ ہوکر عہد کیا کہ ہم پر آرام حرام ہے جب تک گنگوہ کے راجہ گنگ سے تیر ابدلہ نہ لے لیں۔ لہٰذا مجلس شوریٰ منعقد کی گئی اور آئندہ کے لیے حالات کے مناسب لائحہ عمل تیار کر کے نہایت عالم و فاضل، مدبر، دلیر، جنگجو، ماہرین حرب ستائیس (۲۷) انصار نفوس پر مشتمل ایک جماعت گنگوہ کے لیے روانہ کر دی گئی۔ اور انھیں ہدایت دی گئی کہ کسی محفوظ مقام کو اپنا مستقر بنا کر پہلے وہاں کے حالات و ماحول کا خصوصی طور سے مطالعہ کریں۔ جب پوری معلومات حاصل ہو جائیں تو ہم کو مطلع کریں تا کہ دوسری جماعت بھیجی جا سکے اور حالات کے مطابق دوسرا لائحہ عمل طے کیا جائے۔ یہ ستائیس انصار مقام بہ مقام چلتے چلتے دریائے جمنا پار کر کے گنگوہ کے علاقہ میں پہنچے اور قلعہ سے جانب شمال قریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک طویل وعریض بن میں مقیم ہو گئے۔ اول ان حضرات نے کنواں اور ایک کچا کوٹھا تیار کیا جو بطور مسجد تھا۔ یہاں مقیم ہو کر ان لوگوں نے گنگوہ کے اردگرد کا جائزہ لیا اور بستی میں خفیہ طور پر داخل ہو کر یہاں کے حالات معلوم کیے۔ اس جماعت کے سربراہ حضرت خواجہ شیخ امام ابو محمد آخونؒ ہراتی تھے۔ اسی لیے یہ بن آج تک ''بنی امام صاحب'' کہلاتی ہے۔ اولیاء اللہ کی اس جماعت نے یہاں رہ کر معلوم کیا کہ یہ راجہ ظالم و جابر اور مجرمانہ اخلاق کا حامل ہی نہیں بلکہ مغلوب الغضب بھی ہے اس کے یہاں یہ بات بڑی معمولی جانی جاتی ہے اور اس کا یہ معمول بن گیا ہے کہ جو دلہن یہاں سے جاتی ہے یا نئی دلہن یہاں آتی ہے اس کو یہ راجہ پہلے ایک رات اپنی خوابگاہ میں رکھتا ہے۔ باراتیوں کو اس رات قلعہ میں قید رکھا جاتا ہے۔ اس راجہ نے نئی دلہنوں کی معلومات وتلاش کی یہ ترکیب اپنا رکھی ہے کہ قلعہ کے بُرجوں پر تعینات سپاہیوں کو ہدایت ہے کہ جو بارات شہر میں داخل ہو یا شہر سے باہر جائے تو مجھے فوراً مطلع کیا جائے اس طرح یہ راجہ نئی دلہنوں سے جبراً و قہراً ہم بستر ہوتا تھا۔[1] راجہ کی اس ظالمانہ اور مجرمانہ عادت وروش سے خود اس کی رعایا بھی ناخوش

---

[1] آلوک ۱۹۸۰ء، ایڈیٹوریل نوٹ ص ۵۱

ونالاں تھی۔اسی وجہ سے یہاں کے حالات وکوائف بہت جلد انصار کو معلوم ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مجلس شوریٰ کو یہاں کے پورے پورے احوال کہلا بھیجے۔ وہاں سے فوراً ہی ایک اور جماعت پچیس انصار مجاہدین پر مشتمل روانہ کردی گئی۔ دوسری جماعت گنگوہ پہنچ کر پہلی جماعت سے جانب شمال ایک میل کی دوری پر ٹھہرائی گئی۔ یہ جگہ بھی جنگل اور بن تھی۔ اس جماعت نے بھی پہلوں کی طرح وہاں ایک کنواں اور مسجد کا چبوترہ تعمیر کیا۔ یہ جنگل قصبہ گنگوہ اور موضع خان پور گوجر کے درمیان واقع ہے۔ اور اب ''بنی ہفت شہیداں'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس دوسری جماعت کے سپہ سالار متدین عالم، دانشور، روشن ضمیر، مشہورِ عوام بنام حضرت بالوپیر یا پیر مجلس تھے۔ دوسری جماعت والوں نے امام صاحب ابومحمد آخونؒ کو مطلع کیا کہ یہاں کے دستور کے مطابق ایک بائیس (۲۲) نفری مجاہدین کی جماعت بارات کی شکل میں آرہی ہے۔ یہ سب حضرات نہایت متشرع، عالم وفاضلِ وقت، حق آگاہ، اہل دل، جری اور شجاع نوجوان نفوس ہیں۔ ان کے امیر حضرت خواجہ وصی الدین ہیں جو ایک جرأت مند، جنگی امور کے ماہر عالی حوصلہ عالم اور شیخ روزگار فرد ہیں۔۔۔۔
آخرکار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور اطلاع آئی کہ چند ایام میں مجاہدین کی تیسری جماعت بارات کی صورت میں گنگوہ پہنچ رہی ہے۔ اُن کے آتے ہی یہاں کے تمام حضرات رات کے اندھیرے میں خفیہ خفیہ بارات میں شامل ہوجائیں.....ایک دن بوقت عشاء جب تمام شہر میں اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا اور اہل گنگوہ نیند کی آغوش میں محوخواب تھے۔ شہر کے جنوبی دروازے کے قریب یہ بارات پہنچی ہی تھی کہ دروازہ کھلا اور قلعہ کے سپاہیوں نے جبراً بارات کو اندر لے لیا۔ اور دلہن کو یکبارگی راجہ کی خوابگاہ میں پہنچا دیا۔ راجہ نے اشتیاق و بے تابی میں ڈولی کا پردہ اٹھایا تو دلہن نے معاً ہی سرعت کے ساتھ راجہ کے پیٹ میں تیز دھار خنجر اُتار دیا۔ راجہ زخم کی تاب نہ لاکر دم کے دم میں وہیں ڈھیر ہوکر فی النار جہنم ہوگیا۔ چونکہ حملہ نہایت جوشِ ایمانی کے ساتھ جوان ہاتھوں نے کیا تھا۔ اس لیے حریف کے بچنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی دلہن کے بھیس میں خود حضرت غازی وصی الدین عرف شاہ قطب موجود تھے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو راجہ کے قتل کی اطلاع زوردار چیخ مار کردی۔

گویا یہ چیخ پہلے سے تجویز شدہ خفیہ کوڈ تھا جسے سن کر تمام مجاہدین نے اہل ہنود کو مارنا کاٹنا شروع کر دیا۔ قلعہ کے سپاہیوں میں اچانک حملہ سے کھلبلی مچ گئی۔ وہ بھی برافروختہ ہو کر جدال وقتال میں مشغول ہو گئے۔ مگر ان کے واروں میں تیزی وتندی نہیں تھی۔ وہ صرف اپنا دفاع کر رہے تھے۔ مگر مجاہدین، غازی انصار کی تلواریں جارحانہ شعلے اُگل رہی تھیں۔ کیونکہ وہ عین مسلمانی ولولے، جذبۂ ایمانی، اسلامی دلیری نہایت جرأت وہمت کے ساتھ مصروف جنگ تھے۔ سپاہی زیادہ تر، مر رہے تھے، کیونکہ ان کے دلوں پر گھبراہٹ سوار تھی۔ افراتفری اور گھبراہٹ میں سپاہیوں نے شہر پناہ کے دروازے کھول دیے۔ اور جدھر جس کا منھ اٹھا بھاگنے، دوڑنے لگے مگر مقابلہ بھی کرتے رہے۔ مجاہدین بھی تعاقب کرتے کرتے مارکاٹ میں بھی مصروف رہے۔ ہر طرف لڑائی کا بازار گرم تھا۔ سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور غازی صرف چوہتر نفر اس لیے شہید ہو ہو کر کم ہوتے گئے۔ شہر کے چاروں طرف معرکہ آرائی تھی۔ ہر طرف انسانی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ اس لڑائی میں ستر انصار شہید ہوئے اور سپاہی ہزاروں مرے، صرف پانچ غازی بچے جن کو حراست میں لے کر پرتھوی راج چوہان کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے دہلی روانہ کر دیا گیا۔ لیکن اس وقت ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج چوہان کا مقابلہ تراوڑی متصل شہر کرنال میں شہاب الدین محمد غوری سے ہو رہا تھا۔ اس لیے وقتی طور پر ان پانچ انصار مجاہدین کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ مگر اس جنگ میں پرتھوی راج چوہان مارا گیا۔ حکومت دہلی اور مضافات دہلی میں غدر کا سا ماحول پیدا ہو گیا۔ انصار جیل میں بے یارومددگار پڑے رہے۔[1] اس معرکہ آرائی میں سالار کارواں حضرت خواجہ وصی الدین نے بھی درجۂ شہادت پایا۔ ان شہیدوں کے مزارات راجہ کے ان مخالفین نے بنانے میں مدد کی جو راجہ کی عیاشی سے متنفر تھے۔ کیونکہ اس معرکہ کی خبر تو دیگر انصاریان کو بھی تھی چند حضرات پنجاب سے براہ لکھنوتی گنگوہ آئے اپنے لواحقین کے مزارات انھیں جگہوں پر بنادیے وہ جہاں شہید ہوئے تھے۔

خواجہ وصی الدین کا مزار آج بھی اندرون قلعہ میں ہی ہے۔ آج کل یہ مزار دفتر

---

[1] منہاج، ص ۱۲۰، جامع تاریخ ہند، ص ۲۳۷، مطبوعہ ترقی بیورو دہلی، ۱۹۸۴ء، شارٹ ہسٹری آف انڈیا ۵۳، سٹی بک ہاؤس کانپور، مصنفین جے دیو وامیر چند مہرا

میونسپل بورڈ کے احاطے میں موجود ہے اور مرجع خاص و عام ہے۔ شاہ کلکلی کے نام سے مشہور ہے۔ قلعہ کی آبادی اور شہر پناہ کا موجودہ جنوبی دروازے کے قریب ایک طویل وعریض تکیہ ہے وہاں مولانا شاہ چراغ محمد کا مزار ہے (یہ مزار ۱۹۵۸ء تک موجود تھا مگر اب یہاں گھنی آبادی ہونے کی وجہ سے موجود نہیں ہے۔ انور) اسی تکیہ سے بالکل متصل ایک اور شہید کا مزار ہے (یہ مزار محمد یوسف قریشی کے مکان کے سامنے ان کے چبوترے پر آج بھی موجود ہے۔ انور) ایک مزار پولیس چوکی کے دروازۂ غربی کے قریب لالہ جانکی داس بزار کی دوکان کے پاس ہے (نہ اب دوکان باقی ہے نہ مزار ہے انور) ایک شہید کا مزار قلعہ کے شرق میں مسجد پیر جی والی کے مغرب والی گلی میں خواجہ عبدالخالق کا ہے۔ جو پیر بھیلی والے یا پیر برنے والے مشہور ہیں۔ قبرستان سیّدان محلہ غلام اولیاء میں شہدا کے بہت مزارات موجود ہیں۔ آبادی سے باہر موضع مہوڑہ گوجران کی کچی سڑک سے ملا ہوا قلعہ سے جنوب میں ایک قدیمی قبرستان ہے اس میں برگد اور پاپڑی وغیرہ کے تناور اور گنجان درخت ہیں اسی وجہ سے یہ قبرستان "بھوتڑے بڑ" بھی کہلائے جاتے ہیں۔ یہاں کئی شہدا کے مزارات ہیں۔ یہاں ایک مزار حضرت شیخ سالار کا ہے۔ دو شہدا کے نام ایک حضرت شیخ سعد اور دوسرے حضرت شیخ سعدی کے مزارات موجود ہیں۔ یہ دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ اس قبرستان سے جانب شرق اور عیدگاہ شہر کے مغرب میں حضرت شیخ شاہ نصیرالدین شہید کا مزار ہے۔ شیخ نصیرالدین بن قاضی شیخ کریم الدین ابن شیخ عیسیٰ بن شیخ داؤد حضرت شیخ نصیرالدین بابا فریدالدین گنج شکر کے عم زادہ ہیں[1] اس مزار سے مشرق میں اور عیدگاہ شہر سے جانب شمال ایک طویل وعریض قبرستان میں حضرت شیخ شاہ بصیرالدین شہید شاہ ولایت آرام فرما رہے ہیں۔ یہاں ایک مسجد اور چاہ پختہ بھی ہے شاہ بصیرالدین ابن شیخ شہاب الدین ابن شیخ احمد ابن شیخ سعد حاجی چشتی۔ یہ بھی بابا فریدالدین گنج شکر کے عم زادہ ہیں[2] (اس قبرستان میں اس وقت نہ یہاں مسجد ہے اور نہ کنواں موجود ہے۔ ہاں پہلے مسجد و کنواں ضرور ہوگا۔ کیونکہ ۱۹۵۵ء میں لب سڑک قبرستان سے ایک پتھر کا بنا ہوا مصلےٰ بہتر حالت میں برآمد ہوا ہے،

۱و۲ جواہر فریدی اردو، ص ۲۳، مطبوعہ ۱۰۳۳ھ، مرتبہ شیخ محمد غوری گوالیری

جسے یہاں نوتعمیر مسجد نئی آبادی محلہ قریشیان میں لگادیا ہے۔انوؔر) اس قبرستان سے جانب
شمال نانوتہ روڈ کے قریب حضرت شیخ شہاب الدین شہید کا مزار ہے۔اراضی مزروعہ برائے
مصارف چاہ پختہ ومسجد ہے۔(ارضی مزروعہ وچاہ پختہ موجود نہیں ہے۔البتہ اب یہاں کافی
طویل وعریض قبرستان ہے اور قبرستان بھلیمان کے نام سے مشہور ہے نیز ایک مزار پختہ
ایک مزروعہ کھیت میں اس قبرستان سے باہر موجود ہے جو کہ قدیم لگتا ہے ہوسکتا ہے مزروعہ
اراضی لوگوں نے دبالی ہو اور مزار توڑنے کی ہمت نہ جُٹا سکے ہوں اسی لیے آج تک یہ مزار
باقی ہے۔انوؔر) اس مزار سے مغرب میں ایک طوایل تکیہ ومزار حضرت شیخ اصغر علی شہید کا
ہے۔(یہ مزار ۱۹۹۰ء تک تالاب سیدان محلہ غلام اولیاء کے کنارے موجود تھا اور کئی بیگہ زمین
پر مشتمل تکیہ موجود تھا۔مگر یہ زمین یہاں کے سیدوں نے فروخت کردی ہے اب یہاں گھنی
آبادی ہے۔مزار موجود نہیں ہے۔جہاں پہلے مزار تھا اب وہاں ایک مسجد تعمیر ہوگئی ہے۔
جب مغل سرائے سے تیتروں، نانوتہ روڈ کے بس اسٹینڈ پر جایا جاتا ہے تو یہ مزار اس نئے روڈ
سے بالکل متصل تھا۔انوؔر)

آبادی میں لب سڑک تکیہ میں ایک مزار حضرت شیخ شاہ عبداللہ نیکمرد غازی شہید کا
ہے۔مسجد، چاہ پختہ اور طویل وعریض اراضی برائے مصارف موجود ہے (اس مزار میں
بازار اور سبزی منڈی ہے۔یہ اراضی اتنی زیادہ ہے ایک بڑا محلہ آباد ہوسکتا ہے۔اور اس قدر
قیمتی ہے کہ مزار ومسجد کو سونے چاندی کے بنائے جاسکتے ہیں۔کروڑوں کی ملکیت ہے۔
لاکھوں روپیہ ماہانہ وصول ہوتا ہے مگر یہ آمدنی اچھے ہاتھوں میں نہیں ہے اس لیے سرمایہ خورد
برد ہورہا ہے اور مسجد ومزار کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔انوؔر) اسی تکیہ میں جانب مغرب حضرت
شیخ صابر علی شہید کا مزار، زیر درخت املی موجود ہے۔(اب یہ مزار موجود نہیں ہے یہاں
دوکان بن گئی ہے۔انوؔر) ایک مزار تکیہ حضرت غازی عبداللہ نیکمرد سے جانب شرق گوشۂ
شمال میں چُن گڈھے تالاب کے مغرب میں کیت کے درخت کے نیچے حضرت شیخ سراج
الدین شہید کا ہے ان کا تکیہ ایک طویل وعریض جگہ پر مشتمل ہے۔(یہ زمین سینکڑوں بیگہ
زمین پر مشتمل تھی تمام زمین برائے آبادی ایک شخص فیروز موچی نے کسی پٹواری سے مل کر

فروخت کردی ہے اب یہ مزار محلہ چھتہ چماران میں سے ایچ آر انٹر کالج کو جاتے ہوئے روڈ کی ایک مختصر سی گلی میں جو اندر سے بند ہے میں ذرا سی جگہ میں ہے۔ ناگفتہ بہ حالت میں اہل ہنود کے درمیان ہے۔ کوئی پرسان حال نہیں۔ بلکہ اس مزار کے بارے میں مسلمانوں کو بھی کم ہی معلوم ہے۔ انور) ایک مزار حضرت شیخ احمد حسن کا محلّہ سیدان جانب شرق موجود ہے۔ (یہ مزار اب موجود نہیں ہے یہاں اب دوکانیں تعمیر ہوگئی ہیں۔ انور) ایک مزار جانب شمال مسجد شاہ شرف الدین املی کے درخت کے نیچے ہے آپ کا نام حضرت شیخ سعداللہ شہید ہے۔ (اب یہاں نہ املی کا درخت ہے اور نہ مزار باقی ہے بلکہ اب یہاں ایک گلی آمد و رفت کے لیے موجود ہے۔ انور) ایک شہید کا مزار محلّہ بہاؤالدین متصل لال مسجد جنوب میں حضرت شیخ سعیدالدینؒ کا ہے۔ (آبادی ہو جانے کی وجہ سے اب یہ مزار باقی نہیں ہے۔ انور) ایک مزار سہارنپور روڈ پر حضرت شیخ حمیدالدین کا ہے جو پاپڑی کے درخت کے نیچے ہے اور پاپڑی والے پیر مشہور ہیں۔ (شیخ سراج الدین محلّہ چھتہ شیخ سعیدالدین محلّہ بہاؤ الدین، شیخ حمیدالدین پیر پاپڑی والے۔ تینوں حقیقی بھائی ہیں انصار ہیں اور بزرگان ہرات سے ہیں۔ یہ معلومات قدوسی حضرات کی قدیمی قلمی بیاض موسومہ مجمع الاسرائر میں ہے۔ میں نے یہ بیاض اور یہ بیان بچشم خود حضرت شاہ قریش احمد قدوسی کے یہاں دیکھی ہے۔ انور) ایک مزار قصبہ گنگوہ سے شمال مشرقی گوشہ میں موضع جنڈھڑا میڈیکل وانجینئرنگ کالج روڈ سے بالکل متصل اور قبرستان ٹانکان کے قریب حضرت شیخ بالو پیر شہید کا ہے جو اب پیر مجلس کے نام سے مشہور ہے۔ پرانے قلمی کاغذات میں تکیہ واراضی بھی تحریر ہے۔ غالباً زمین لوگوں نے ہتھیالی ہوگی کیونکہ اس وقت تو یہاں سارا علاقہ جنگل ہی تھا بہرکیف پیر مجلس مشہور ہونے کی غالباً یہ وجہ ہے کہ یہاں کے کھیتوں کے ہمسائے بیان کرتے ہیں کہ اکثر وبیشتر ہم نے اپنے ہوش وحواس کے ساتھ دیکھا ہے کہ رات میں یہاں روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔ آس پاس کی صفائی کی جاتی ہے۔ فرش اور قالین بچھائے جاتے ہیں اور بزرگانہ وضع قطع کے حضرات کا ہجوم ہوتا ہے۔ گھنٹوں باہمی بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ اُن کی آوازیں ہم تک پہنچتی ہیں مگر اُن کی باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔ کیا معاملات درپیش

ہوتے ہیں۔ کن مسائل پر بات ہوتی ہے۔ کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ ہم اگر ان کے قریب جانا چاہتے ہیں تو قدرتاً ہمارے قدم اُدھر کو اٹھتے ہی نہیں۔ ہم ان سے خوف زدہ بھی نہیں ہوئے بلکہ ان سے مانوسیت محسوس کرتے ہیں۔ البتہ اُس وقت ہم پر ان کی شخصیتوں کا اک عجیب سا رعب طاری رہتا ہے اور یہی رعب ہمیں ان سے قریب تر نہیں ہونے دیتا۔ اسی طرح کے بیانات گنگوہ کے اکثر بزرگ حضرات بیان کرتے نہیں تھکتے۔ جن میں مُلاّ عبدالرحمٰن محلّہ اشرف علی، منشی عبدالکریم، شہامت علی محلّہ ٹانکان، ملا عبدالرحمٰن مؤذن باہرلی مسجد، الحاج صوفی رشید احمد محلّہ غلام صابر، میرے ماموں کلو محلّہ اشرف علی، نمبردار الحاج قاضی مسعود احمد، شاہ قریش احمد قدوسی وغیرہم۔ اس مزار سے جانب شمال موضع خان پور، روڈ سے متصل سات شہیدوں کے مزارات ہیں۔ چاہ پختہ، مسجد اور بہت سی اراضی موجود ہے۔ ۱۹۷۰ء تک بہت سا حصہ بدستور تھا۔ جس میں شیشم، نیم، ببول، جامن، لہسوڑہ، کیت، سرس وغیرہ بہت سی قسم کے قدیم اور تناور درخت طرح طرح کے جھاڑ جھنکاڑ بیلیں، درخت برنا پہاڑی ببول کافی تعداد میں تھے، ایک حصہ میں کنواں چبوترہ مسجد اور مزروعہ زمین موجود تھی۔ ایک اونچے چبوترے پر ایک ہی لائن میں سات شہیدوں کے مزارات تھے۔ مزارات اور اس بی کی دیکھ بھال قریباً پچاس سال سے رحمت علی شاہ گنگوہی کرتے تھے۔ میں نے مزروعہ زمین میں رحمت علی شاہ کو ہی کاشت کرتے دیکھا ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۹ء تک میں مدرسہ احمد العلوم خان پور میں مدرس اور محرر رہا ہوں۔ ۱۹۷۷ء میں اہل خان پور نے یہاں کے تمام درخت بنام مدرسہ فروخت کر کے تمام بی پر مدرسے کے نام سے قبضہ کیا اور رحمت علی شاہ کو وہاں سے بھگا دیا قریباً پچاس بیگہ زمین پر مدرسہ کاشت کررہا ہے۔ کنواں اور چبوترہ مسجد اب یہاں کچھ نہیں ہے۔ صرف مزارات کا چبوترہ ہی باقی چھوڑا گیا ہے۔ سڑک سے مزار تک راستہ بھی نہیں چھوڑا۔ زائرین بدقت مزارات تک پہنچ پاتے ہیں۔ انور ایوبی) بی ہفت شہیداں سے گنگوہ آتے ہوئے اور گنگوہ کے شمال میں ایک شہید کا مزار سادے والے کھیت میں نیم کے درخت کے نیچے موجود ہے۔ (یہاں اب چاروں طرف آبادی ہوگئی ہے ایک طرف ایچ آر انٹر کالج ہے اور تین طرف آبادی ہے مگر یہاں تھوڑی سی زمین باقی پڑی ہے۔

مزار موجود نہیں ہے۔ ایک پڑوسی نے بتایا کہ یہ زمین مزار کی ہے۔ کچھ لوگوں کے کہنے پر اس شخص نے چھوڑ دی تھی جس کا مکان اس زمین کے پاس ہے۔ اس شخص نے مزید کہا کہ جب یہاں کوئی مسلمان آباد نہیں ہے نہ ہی کوئی مسلمان اِدھر توجہ دیتا ہے تو یہ زمین بھی کوئی یہاں کا باشندہ ہتھیا لے گا۔ (انور) اِس جگہ سے مغرب میں چند کھیت اور سڑک چھوڑ کر بنی امام صاحب آجاتی ہے اس طویل وعریض قبرستان میں حضرت امام ابومحمد آخونؒ شہید ہراتی آرام فرمار ہے ہیں۔ چاہ پختہ اور مسجد موجود ہے۔ (ہمارے بزرگوں کا بیان ہے کہ یہ قبرستان قریباً دوسو بیگہ زمین پر مشتمل تھا۔ دب دبا کر اب صرف ایک سوبیس (۱۲۰) بیگہ رہ گیا ہے۔ یہاں بڑے بڑے علماء، فضلاء، حکماء، اولیاءاللہ اور یگانۂ روزگار حضرات آرام فرما ہیں۔ اس قبرستان کے مغرب میں عام راستہ ہے اور تین اطراف میں لوگوں کے کھیت ہیں۔ ہر طرف کے کھیت والے تھوڑی تھوڑی کر کے اس کی زمین اپنے کھیتوں میں ملاتے رہے ہے۔ اس قبرستان کے جنوب میں بابولطیف کا چھوٹا سا قبرستان ہے شمال مشرقی گوشہ کی طرف اور شمال مغربی گوشہ میں برگدوالے شہید کا مزار ہے۔ جو کبھی دونوں گوشے اِسی بنی امام صاحب کا حصہ تھے۔ مگر اب ان دونوں گوشوں کے اور بنی امام صاحب کے درمیان مزروعہ زمین ہے جس میں کاشت ہوتی ہے۔ اوائل ۱۹۹۰ء تک بنی امام صاحب کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ مگر قاضی راشد مسعود چیئرمین گنگوہ اور قاضی رشید مسعود ایم پی ہیلتھ منسٹر حکومت ہند نے اس قبرستان کی طرف توجہ مبذول کی اور سرکاری پٹواری سے پیمائش کرائی تو کئی بیگہ اراضی واگزار ہوئی چنانچہ شمالی سمت کی نکلی ہوئی زمین میں پاپولر کے درختوں کا حاشیہ بھروایا۔ اسی دوران الحاج سیٹھ محمد یوسف گنگوہی نے اپنے زرکثیر سے چہاردیواری کرائی اور اندرون قبرستان کے تمام جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی پر مزید صرفہ کیا۔ قبرستان کے مغربی درمیانی حصہ پر قابل دید شاندار ہال تعمیر کرایا۔ مسجد امام صاحب کی مرمت اور فرش مسجد ازسرنو بنوایا تاکہ آنے والے زائرین بارش اور دھوپ سے بچ سکیں نیز جنازہ سہولت کے ساتھ یہاں رکھا جاسکے اور شرکا آرام سے یہاں بیٹھ سکیں۔ ہال کے دروازے کے علاوہ مغربی دیوار میں تین اور دروازے رکھے تاکہ میتیں دوسرے دروازوں سے بھی قبرستان

میں آسکیں۔ اسی دوران منتظمہ کمیٹی کے دوارکان الحاج سعید احمد مہتر اور قاضی محمد نعیم ایوبی نے ہال کے دروازے سے درگاہ تک پختہ سڑک بنوائی۔ ہال کے متصل پانی کا ایک نل لگوایا بلکہ تمام قبرستان میں آنے جانے کے لیے روشیں وغیرہ بنوا کر روشوں کے دونوں طرف سفیدے کے درخت لگوائے۔ اللہ تعالیٰ سیٹھ محمد یوسف کو اجر عظیم عطا فرمائے کہ انھوں نے ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔ اندرون احاطہ امام صاحب میں شہدا کے پانچ مزارات اور موجود ہیں جو حضرت کے مزار کے سامنے جانب جنوب دیکھے جاسکتے ہیں۔

حضرت شیخ خواجہ ابو محمد آخونؒ کا مزار ہمہ وقت زیارت گاہ خاص و عام ہے (بنی امام صاحب سے جانب جنوب محلّہ محمد غوریؒ میں قاضی منیر اللہ عرف خیراتی عرف صاحب جان کے مکان میں ایک شہید کا مزار ہے اور اسی مزار کے قریب لب سڑک ایک اور شہید کا مزار ہے۔ (زیر دیوار لب سڑک والا مزار، سڑک اونچی اور پختہ ہو جانے کی وجہ سے نابود ہو گیا۔ البتہ دوسرا مزار اندرون مکان آج بھی موجود ہے۔ ہم نے جب یہ مکان از سر نو تعمیر کیا تو یہ مزار دیوار میں آتا تھا ہم نے اس تربت کو بدستور ہی رہنے دیا اور دیوار بھی وہیں کو بنائی مگر تربت کی جگہ کے اوپر لینٹر ڈال کر دروازہ بند کر دیا مگر مزار کی پہچان باقی رکھ دی۔ انوؔر) ایک شہید کا مزار قاضی مسعود احمد چیئر مین گنگوہ وایم ایل اے کے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے ہے جو میراں شہید کے نام سے مشہور ہے۔ (یہ مزار اب موجود نہیں) ایک شہید کا مزار بنی شاہ ولایت سے شمال میں خمروں والی گلی میں موجود ہے۔ ایک شہید کا مزار لال مسجد محلّہ بہاؤ الدین کے جنوب میں محلّہ گوجران کے قریب ہے[1] (یہ مزار اب نہیں ہے) ایک شہید کا مزار لال مسجد کے بالکل پشت کے قریب ہے جو حضرت بابا، تاج الدین کے نام سے مشہور ہے۔ دو مزارات محلّہ مبارک علی سرائے میں حضرت شیخ صادق محبوب الٰہی قدوسی کی درگاہ کی پشت پر املی کے درخت کے نیچے موجود ہیں۔ ایک انصاری شہید کا مزار حضرت شیخ ابو سعیدؒ قدوسی کی درگاہ کے پشت پر موجود ہے۔ الغرض گنگوہ کے چاروں طرف اور اندرون قصبہ متعدد انصار شہدا کے مزارات تھے اور بہت سے ابھی تک بھی موجود ہیں۔ اس وقت

---

[1] اس شہید کا نام حضرت شاہ جلالؒ ہے۔

۲۰۰۳ء میں مندرجہ ذیل شہدا کے مزارات زیارت گاہ خاص و عام ہیں۔ یہاں ان شہدا کا تذکرہ ہے جو راجہ گنگ کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے ہیں۔ ورنہ اور شہدا کے بھی مزارات یہاں موجود ہیں جو بعد کے ہیں اور ان کا تذکرہ آئندہ آئے گا۔

(۱) حضرت خواجہ وصی الدین عرف پیر کلکلیؒ احاطہ دفتر میونسپل بورڈ (۲) حضرت شیخ عبدالخالقؒ پیر بھیلی والے، مسجد پیرزادگان محلّہ غلام اولیاء کے سامنے والی گلی میں (۳) حضرت شیخ بصیر الدینؒ شاہ ولایت متصل قبرستان عیدگاہ شہر (۴) حضرت شیخ شہاب الدینؒ بنی بھلیمان نانوتہ روڈ (۵) حضرت شیخ عبداللہ نیکمرد، بازار سبزی منڈی (۶) حضرت شیخ بالو شہید پیر محلس متصل قبرستان ٹانکان جندھیڑا روڈ (۷) ہفت شہدا، خان پور روڈ (۸) حضرت شیخ امام ابومحمد آخونؒ ہراتی، بنی امام صاحب (۹) حضرت شیخ پیر برگد والے، بنی امام صاحب کے نزدیک (۱۰) حضرت شیخ حمید الدینؒ پاپڑی والے پیر، سہارنپور روڈ (۱۱) حضرت شیخ بابا تاج الدینؒ متصل لال مسجد محلّہ بہاؤالدین۔

چوہتر انصار غازیوں میں سے صرف پانچ نفر زندہ بچ سکے تھے جو دہلی کے قید خانہ میں پڑے ہوئے تھے۔ جب قطب الدین ایبک دہلی کا بادشاہ ہوا اور مقامات سرکاری میں شاہی لشکر آ کر ٹھہرا تو بہت سے سپاہی قید خانے کی ایک طویل و عریض عمارت میں خیمہ زن ہوئے۔ ایک خیمہ میں قاضی شمس الدین جو حضرت خواجہ امام ناصر الدین جالندھری کی اولاد میں سے ہیں اقامت پذیر تھے۔ آپ اُس وقت قاضی القضات کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ آپ کا مزار حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار اقدس کے قریب مہرولی دہلی میں ہے۔ ایک روز قاضی صاحب موصوف کسی مسئلہ کے لیے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ بہت دیر تک کتاب میں مسئلہ کا حل سمجھ میں نہ آیا تو تھک ہار کر کتاب کو جوں کا توں وہیں چھوڑ کر دربار شاہی میں چلے گئے۔ چونکہ یہ مکان انصار قیدیوں سے بالکل ملا ہوا تھا۔ ان کو قاضی صاحب کی حرکات وسکنات نظر آ رہی تھیں اس لیے ان قیدیوں میں سے ایک قیدی خواجہ حسین جو کہ زبردست عالم و فاضل تھے انھوں نے اِس کتاب کو اٹھا کر دیکھا تو کتاب میں مسئلہ غلط لکھا ہوا تھا۔ لہٰذا خواجہ حسین نے اصل مسئلہ اور اس کا حل اسی کتاب کے حاشیہ پر تحریر کر کے کتاب اُسی جگہ پر اُسی طرح رکھ

دی۔ دربار شاہی سے قاضی صاحب واپس آئے اور کتاب کو دیکھا تو حاشیہ پر ان کا مقصود تحریر تھا۔ آپ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ حیرانی کے عالم میں فوراً ماتحتوں سے پوچھا کہ کتاب کس نے اٹھائی تھی؟ انھوں نے عرض کیا، ایک قیدی نے کتاب اٹھائی تھی۔ تب قاضی صاحب نے خواجہ حسین کو طلب کیا اور پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم پانچ ایوبی النسل انصار ہیں اور کل حالات بتلائے۔ اب تک ان انصار کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ان کی ظاہری ہیئت وحشیوں جیسی ہوگئی تھی قاضی صاحب ان کے احوال ومشکلات سے آگاہ ہوئے تو خونی رشتوں، اپنائیت، برادرانہ جذبوں اور اسلامی حمیت واخوت سے سرشار ہوکر معذرت خواہ ہوئے اور دربار شاہی میں جاکر ان کا احوال عرض کیا۔ بادشاہ قطب الدین ایبک نے ان کے حالات سن کر افسوس کیا اور اسی وقت قید سے رہائی دی۔ نیز پانچوں انصار کو بہترین پوشاک عطا کر کے دہلی میں قیام کے لیے فرمایا — مگر انصار ملتمس ہوئے کہ ہم یہاں رہنا نہیں چاہتے بلکہ جہاں ہمارے برادران شہید ہوکر آرام فرما ہیں وہیں جا کر بسنا چاہتے ہیں — قاضی شمس الدین کی سفارش اور انصار کی منشاء کے مطابق بادشاہ نے تھوڑی سی فوج حضرت شاہ محمد غوریؒ ہراتی کی سرداری وسرکردگی میں انصار کے ہمراہ گنگوہ کی طرف روانہ کیا۔ گنگوہ پہنچ کر انصار اور غوریوں نے گنگ راجہ کے بقیہ فوجیوں سے جنگ آزمائی کی۔ گنگ راجہ کے فوجی بے دلی کے ساتھ لڑتے ہوئے قتل ہوئے اور اس طرح مکمل طور پر گنگوہ فتح ہوئی اور قلعۂ گنگ انصار کے قبضہ میں آیا۔ مگر سردارِ فوجِ غور حضرت شاہ محمد غوریؒ نے اس معرکہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ آپ کا مزار قلعہ سے جانب شمال زیر دیوار شہر پناہ معہ تکیہ وچاہ پختہ موجود ہے۔ (آپ کے تکیہ کی کافی زمین ابھی تک خالی پڑی ہوئی ہے۔ ۱۹۷۸ء تک یہاں ایک طویل وعریض قدیمی کنواں تھا جس سے عوام الناس پانی بھرتے تھے۔ پانی خشک ہوجانے کی وجہ سے یہ کنواں بھر دیا گیا ہے۔ حضرت کے نام پر ہی یہاں ایک محلہ محمد غوری کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ اسی محلہ میں آپ کا مزار، زیارت گاہ عام وخاص ہے حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دلّی نے خیرالمجالس میں اور صاحب خزینۃ الاصفیا جلد اوّل ص ۳۰۳ پر اور جواہر فریدی میں ص ۳۴۲ پر درج ہے کہ آپ مرد اہل صلاح، عالم، متقی، اہل علم فرد

تھے۔ بابا فرید الدین گنج شکر کے انتیسویں خلیفہ تھے۔ گویا آپ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی، حضرت جمال الدین ہانسوی اور حضرت خواجہ علاء الدین علی احمد صابر کلیری کے پیر بھائی ہیں۔ قاضی حسین الدین ۱۲۰۶ء میں غوری فوجیوں کے ہمراہ دہلی سے گنگوہ آکر اقامت پذیر ہوئے تو اس دوران ہرات، سندھ اور پنجاب وغیرہ انصار کے بہت سے خاندان یہاں آکر مستقل آباد ہوتے گئے۔ ایک عرصہ تک انصار یہاں نہایت راحت وسکون کے ساتھ حکومت چلاتے رہے۔ راجہ گنگ کی حکومت کا بالکل خاتمہ ہو چکا تھا۔ راجہ گنگ کی مستورات ستی ہو چکی تھیں۔ آج بھی شہر سے باہر مشرقی گوشہ میں تین سادھیاں موجود ہیں جو راجہ گنگ کی بیویوں کی ''ستیاں'' مشہور ہیں۔

دہلی سے غوری حکومت ختم ہوکر سلطان علاء الدین خلجی کا دور شروع ہوا تو ۱۲۹۲ء سے کچھ پہلے گنگوہ اور اس کے مضافات کے اہل ہنود نے بغاوت پر آمادہ ہوکر انصار کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ لہٰذا انصار کا ایک وفد سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں دہلی پہنچا اور گنگوہ کے مکمل حالات اور اپنی مشکلات بیان کر کے مدد کے طالب ہوئے۔ سلطان نے جذبۂ ہمدردی کے تحت اس وفد سے فرمایا کہ تمہاری امداد وہمسائیگی کی خاطر افغانی فوج کے کچھ سپاہی تمہارے ہمراہ بھیج دیے جائیں گے بلکہ تمہارے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ افغان فوجیوں کے قیام اور ان کی گزر بسر کے لیے تم کو کچھ املاک ان کو دینی ہوں گی تا کہ وہ معہ اہل وعیال وہاں مستقل سکونت کر کے آپ لوگوں کی حفاظت کر سکیں۔ انصار نے اس بات کو بخوشی قبول کیا چنانچہ سلطان نے دوسو (۲۰۰) افغان فوجی انصار کے ہمراہ کر دیے اور یہ فوجی گنگوہ میں مستقل آباد ہو گئے۔ ان کے رعب ودبدبہ کی وجہ سے اہل ہنود پھر سے انصار کے باجگزار ہو گئے۔ قاضی حسین الدین اور ان کے چار ساتھی وہ پہلے مسلمان عرب انصار تھے جو مستقل طور پر گنگوہ میں آباد ہوئے۔ گویا گنگوہ میں آمد اور مسلمانوں کی بود و باش انھیں مجاہدوں کا صدقہ ہے کہ آج گنگوہ کا نام اسلامی دنیا ہی میں نہیں ساری دنیا میں وقار کے ساتھ جانا پہچانا جاتا ہے۔

گنگوہ میں انصار عرب ۱۱۸۳ء میں داخل ہوئے اور یہاں کی معلومات، مواقع وحالات اور فضا کی ہمواری کے بعد ۱۱۹۲ء میں راجہ گنگ سے جنگ ہوئی اور وہ مارا گیا۔

چوہتر نفس انصار میں سے ستر مجاہدین شہادت پا گئے۔ پانچ نفر دہلی کی قید میں چودہ سال تک پڑے رہے۔ آخر ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک کے ذریعے رہا ہو کر دوبارہ جنگ کے بعد یہاں کے اقتدار پر قابض ہوئے اور ۱۵۲۶ء تک تین سو بیس سال تک گنگوہ کا اقتدار ان کے قبضے میں رہا۔ گنگوہ کی ابتدا ۶۸۸ء سے ۱۵۲۶ء تک آٹھ سو اڑتیس برس تک یہاں کے سیاسی، سماجی، علمی، ادبی، دینی، اصلاحی، ثقافتی حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ متفرق کتابوں میں مختصر و متفرق معلومات ملتی ہیں یا پھر انصار خاندانوں کے نجی حالات ملتے ہیں وہ بھی نہایت مختصر طور پر — ان میں بھی اکثر میں سنہ غلط درج ہیں ہاں چند معتبر تحریرات بھی ملتی ہیں مگر ان پر تاریخ کا ہی اندراج نہیں یا پھر لکھنے والے کے دستخط ہی نہیں ہیں۔ لیکن ترتیب وتواترِ حالات تعدد واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان متفرق تحریرات کو ہی مستند ماننا پڑتا ہے۔

ان بے ترتیب تحریروں سے انصار کے علم و فضل، کمال و تدبر اور دینی امور کی انجام دہی معلوم ہوتی ہے لیکن مدرسوں، خانقاہوں، کتب خانوں، علمی مذاکروں، شعری وادبی مجلسوں کی کوئی مفید معلومات دستیاب نہیں ہوتیں۔ مگر یہ بھی ناممکنات میں سے ہے کہ علمی گھرانے اور اہل علم حضرات اپنی دینی و دنیوی، علمی وادبی و تاریخی یادداشتیں نہ رکھتے ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ علمی سرمایہ ہم تک آتے آتے، زمانہ کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہا ہو۔ یا پھر ان کے حالات پُرسکون اور سازگار نہ رہے ہوں کیونکہ جس دور کا یہ ذکر ہے وہ زمانہ ہندوستان میں طوائف الملوکی اور بیرونی حملہ آوروں کا زمانہ تھا۔ غزنیوں، غوریوں، مغلوں، افغانیوں کی معرکہ آرائیوں کا یہی وقت ہے۔ ویسے بھی یہ قصبہ پنجاب و دہلی کا بارڈر رہے۔ حملہ آوروں کا راستہ دہلی کے لیے سدا سے یہی رہا ہے اس زمانے میں تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کا چلن نہیں تھا۔ اور افراتفری میں حالات وواقعات نویسی کا کس کو ہوش رہتا ہے۔

بابر اور ابراہیم لودھی کی جنگ کا میدان پانی پت یہاں سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ دونوں حضرات کے لشکروں نے یہاں کے پورے علاقہ کے سکون کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ جس کا زخم تاریخ کے سینے میں آج تک ہے۔ خواص تو خواص عوام کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا۔ اس لیے ہم اس دور کے تاریخ نویسوں کو معذور تصور کرتے ہیں — گنگوہ اپنے

محل وقوع کے لحاظ سے ایسے پسماندہ مقام پر آباد ہے۔ جہاں نہ پولیس ہے نہ ڈاک کا خاطر خواہ انتظام ہے۔ نہ یہاں آمد و رفت کا اچھا انتظام ہے۔ نہ ریلوے لائن ہے نہ کارخانے اور ملیں ہیں۔ جس سے روزگار کا فائدہ ہوتا۔ اور لوگوں کی معیشت و معاشرت بہتر ہوتی۔ گنگوہ کے چاروں طرف بڑے شہر، سہارنپور، مظفرنگر، میرٹھ، کرنال وغیرہ یہاں سے کافی فاصلوں پر ہیں۔ اس لیے یہاں کا معیار زندگی نہایت سادہ اور دیہی طرز کا ہے۔ مگر شہروں اور بڑے کالجوں، دینی مدارس سے دوری ہونے کے باوجود ہر دور میں یہاں تعلیمی بیداری رہی ہے۔ یہاں کے لوگوں کا زیادہ تر پیشہ زمینداری اور کاشت کاری رہا ہے لیکن یہاں کے حضرات اپنے ملک کے ہر شعبۂ حیات میں موجود ہیں۔ بلکہ بیرون ملک بھی اپنی منصبی خدمات انجام دے رہے ہیں گویا غیر معروف، پسماندہ مقام کے باشندے نہ غیر معروف ہیں نہ پسماندگی کے مکیں۔ بلکہ گنگوہ وہ قصبہ ہے جہاں روشن ضمیر صوفی، نیک دل، سادھو سنت، نیک ذات رشی ومنی، مشہور زمانہ محدث، عالم باعمل، کامل ولی، شیوخ و پیر، مفتی وفقیہہ، اقطاب، حکیم، ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، جج، اپیلس نویس، ادیب، شاعر، نقاد، مؤلف، مصنف، مبلغ، غازی، مجاہد آزادی ہر دور میں ہمیشہ موجود رہے ہیں اور جنھوں نے دنیا کے ہر شعبہ میں رہ کر اپنی بہتر کارکردگی سے گنگوہ کا نام روشن کیا ہے۔ اس قصبہ میں زبردست مساوات اور بھائی چارے کی فضا قائم ہے۔ یہاں آج تک کوئی فرقہ وارانہ فساد کبھی نہیں ہوا، سب برادریاں، ہندو مسلم سکھ وغیرہ آپسی اتحاد کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ آج کے مسلم کش اور تعصب پرست دور کا یہاں پر اثر بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ اس قصبہ میں شرافتِ دینی، تہذیب علمی، طب وحکمت اور محبت واخوت، صالح سیاست وقیادت کا فیض عام رہا ہے۔ مرکزی اور صوبائی سیاست میں گنگوہ کا نمایاں کردار تسلیم کیا گیا ہے۔ یوپی کی سیاست کی راہ تو یہیں سے متعین ہوتی ہے۔

حضرت خواجہ امام ابومحمد آخون ہراتیؒ

گنگوہ کے سب سے پہلے امام مولانا شیخ اور مجاہد سرگروہِ اولیا حضرت خواجہ ابومحمد آخونؒ میزبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواجہ ابوایوبؓ انصاری کی اولاد میں سے ہیں۔

اپنے اہل وعیال کے ساتھ ہرات میں قیام پذیر تھے۔ جہاد اور تبلیغ اسلام آپ کی رگوں میں خون کی طرح رواں دواں تھا۔ اسی شوق وذوق کی تکمیل کے لیے آپ بھٹنڈہ شہر اور اطراف واکناف پنجاب میں تھے کہ اسی دوران مجاہدین کی ایک جماعت گنگوہ میں راجہ گنگ (جو ایک عیاش طبع، جابر وظالم حکمراں تھا) سے برائے جہاد جانے والی تھی۔ اس خبر کو سن کر آپ کو تاب نہ رہی بالکل اسی طرح جس طرح آپ کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابوایوبؓ انصاری کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ کو اپنا خلیفہ وقائم مقام بنا کر عراق خوراج سے جنگ کے لیے چلے گئے تھے اور حضرت ابوایوبؓ انصاری کو جہاد سے علاحدہ رہنے کی تاب نہ رہی تھی اور آپ عراق میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ جدال وقتالِ خوارج میں شامل ہو گئے تھے بالکل اسی طرح خواجہ ابومحمد آخونؒ بھی بیتابانہ مجاہدین میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ دیگر بات ہے کہ آپ کے ذاتی محاسن، علمی بصیرت، فضل وکمال، فکر وتدبر اور منفرد سیادت وقیادت، شجاعت ودلیری کی وجہ سے اس جماعت کی امامت وامیری آپ کو ہی سپرد ہوئی۔ آپ مجاہدین کے امام وسپہ سالار کی حیثیت سے گنگوہ تشریف لائے اور راجہ گنگ کی فوج کے ساتھ جدال وقتال میں خوب خوب دادِ شجاعت دے کر دین محمدی پر جاں نثار کر دی اور مرتبۂ شہادت حاصل کیا۔ یکے بعد دیگرے گنگوہ میں غازیانِ اسلام کی تین جماعتیں آئیں مگر جملہ انفاس مقدسہ کے آپ ہی پیر وشیخ تھے۔ اور یہ جنگ آپ کی زیرِ قیادت لڑی گئی۔ ان کے جاں نثاروں میں مولانا شیخ وصی الدینؒ پیر کلکلیؒ، شیخ عبدالخالقؒ، شیخ نصیرالدینؒ، شیخ بصیرالدینؒ شاہ ولایت، شیخ شہاب الدینؒ، شیخ شاہ عبداللہ نیکمرد غازیؒ، شیخ بالو پیر مجلسؒ، شیخ حمیدالدینؒ، شیخ سعیدالدینؒ، شیخ سراج الدینؒ، شیخ بابا تاج الدینؒ، شیخ محمد سعدؒ، شیخ سعدیؒ، شیخ مولانا چراغ محمدؒ، شیخ اصغر علیؒ، شیخ صابر علیؒ، شیخ مولانا شاہ جلالؒ، شیخ قاضی حسین الدینؒ وغیرہ وغیرہ آپ کے رفیق مجاہدین کوئی معمولی افراد نہیں تھے۔ ہر نفس بذات خود علم وفضل، کمال وتدبر، فراست وبصیرتِ دینی، حدیث وفقہ، شریعت وطریقت، معرفت اور حقیقت میں یکتائے زمانہ تھے۔ اور مطلع روحانیت کے آسمان کے چاند اور سورج تھے۔

■■

حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کی گنگوہ میں تشریف آوری و رہائش

گنگوہ سہارنپور ضلع کی ایک غیر معروف و غیر مشہور بستی تھی۔ جس میں جاذبیت کی کوئی چیز نہ تھی۔ علمی، دینی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، روحانی اور صنعتی صفت ایسی نہ تھی جو اسے دوسری بستیوں سے ممتاز و سرفراز کرتی اور بستیوں کی طرح یہ بستی بھی عام بستی اور بے وقعت بستی تھی۔ مگر جب یہاں عرب انصار کے مبارک قدم پڑے تو یہ معمولی سے غیر معمولی اور شریف بستی ہوگئی۔ ان باکمال شیوخ اور اولیاء اللہ انصار کی برکت سے اس شور زمین میں زرخیزی در آئی کہ اس کی خاک سے بے شمار مقتدر، باعظمت اولیاء، باکمال ہنرور، دانشمند اور مفکر و مدبّر پیدا ہوئے۔ جن کے خوشہ نشینوں اور شاگردوں نے گنگوہ کا نام ساری دنیا میں روشن کیا اس طرح گنگوہ کو ہر طرح پر مرکزیت حاصل ہوئی۔ اور بہت سے اہل علم، اہل دل و اہل حق، روشن ضمیر حضرات فخریہ طور پر یہاں آباد ہوئے اور گنگوہ شریف کی شرافت ان کو یہاں کھینچ لائی اور وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ اس بات کی صداقت کے لیے خانوادہ امام ابوحنیفہ کے بدر منیر تنہا قطب العالم امام صوفیاء سرگروہِ جماعت چشتیان حضرت شیخ عبدالقدوسؒ گنگوہی کا نام گرامی ہی کافی ہے۔

حضرت شیخ قصبہ شاہ آباد پنجاب میں سینتیس یا اڑتیس سال مقیم رہے مگر جب بابر نے ۱۵۲۶ء میں دہلی اور آگرہ پر حملہ و قبضہ کیا تو اس کے سپاہیوں نے شاہ آباد کو اس طرح تباہ و برباد کیا کہ دور دور تک سوائے ویرانی کے کچھ نظر نہیں آتا تھا لہٰذا نامساعد حالات میں شیخ شاہ آباد سے گنگوہ تشریف لے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے، یہیں آپ کو درگہہِ حق سے مرتبۂ قطب العالم مرحمت ہوا۔ حضرت قطب العالم منفرد و یگانۂ روزگار عالم، صفِ اوّل کے صوفی، امامِ راہ سلوک، خدا آگاہ و حق پرست، روشن ضمیر پیر، مخلص مسلمان، اعلیٰ اخلاق انسان، بلند مرتبہ مصنّف اور باوقار شاعر تھے[1] لطائف قدوسی میں ہے کہ حضرت شیخ جب شاہ آباد پنجاب سے عثمان کرانی گورنر گنگوہ کی درخواست پر یہاں تشریف لائے تو سب سے پہلے

---

[1] لطائف قدوسی، ص ۳۱ و لطائف قدوسی کی تاریخی اہمیت، ۴۵، پروفیسر محمد اسلم لاہوری

تین دن خواجہ ابو محمد آخونؒ شہید ہراتی کے مزار پر بنی امام صاحب میں معتکف و مقیم رہے اور ایک دن خواجہ عبداللہ نیکمرد غازی شہید کے مزار پر مراقب رہے۔ اسی دوران جمنا کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ جائے تا کہ آپ وہاں قیام کرسکیں۔ چنانچہ جمنا آگے بڑھ گئی اور اپنا بقیہ تالاب چھوڑ گئی۔ حضرت شیخ تالاب کی دوسری طرف آباد ہوئے۔ قصبہ گنگوہ دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک کو سرائے اور دوسرے کو شہر کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں حصے بالکل علاحدہ اور جدا ہیں۔ کیوں کہ ان دونوں کے درمیان ایک اچھا طویل و عریض تالاب حائل ہے۔ تالاب کے درمیان ایک پل اور شرقاً و غرباً لمبی سڑک ہے۔ مشرق کو شہر اور غرب کو سرائے جاتے ہیں۔ قصبہ سے تقریباً چار میل آگے دریائے جمنا بہتا ہے۔ مشہور یوں ہے کہ یہ دریا حضرت شیخ کی تشریف آوری سے قبل گنگوہ کے متصل بہتا تھا۔ مگر آپ تشریف لائے تو روحانیت میں جمنا کو حکم دیا کہ وہ کچھ آگے بڑھ جائے تا کہ آپ وہاں قیام کرسکیں اور آباد ہوسکیں۔ چنانچہ جمنا آگے بڑھ گئی اور اپنا بقیہ تالاب چھوڑ گئی۔ حضرت شیخ تالاب کی دوسری طرف آباد ہوئے اور آبادی کا نام ''سرائے'' رکھا لیکن یہ روایت بظاہر بالکل بے اصل اور یار لوگوں کی من گھڑت معلوم ہوتی ہے کیونکہ تاریخ میں اس کا پتہ نہیں چل سکا۔[1] اسی لیے یہ اوراق لکھتے وقت گنگوہ کے اردگرد کے علاقوں مہوڑہ گوجر، بلاس پور، دودھلا، لکھنوتی، خانپور تیتروں، تیرک پور، تیتروں، خانپور گنگوہ، کمہڑہ، کوٹڑہ، سالار پور، مین پورہ میں جا کر معلومات کیں تو معلوم ہوا کہ پہلے دریائے جمنا گنگوہ کے بالکل قریب بہتا تھا، سالار پور کے مغربی حصے میں جمنا کی اونچی اونچی دیواریں اور زمین کی ناہمواری اور ریتیلی زمین آج بھی بطور ثبوت موجود ہے۔ ایچ، آر، انٹر کالج میگزین کا گنگوہ نمبر ''آلوک'' ۱۹۸۰ء میرے سامنے ہے۔ اس میں قریب قریب تمام لکھنے والوں نے اندر سین گاما، لیکچرر ہسٹری، ہریش چند گوئل، بلبیر سنگھ وید پرکاش اگروال وغیرہ نے لکھا ہے کہ جمنا ندی گنگوہ کے بالکل قریب بہتی تھی۔ مگر ان حضرات نے بھی کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا۔ صرف نجی کاغذات سے نقل کر دیا گیا ہے موضع مہوڑہ کے قریب ماسٹر ناصر علی اور فخر الدین اور لیاقت علی کے کھیت کے قریب کھدائی میں

---

[1] سیرت قدوسیہ، ص ۳۱، مصنفہ حکیم نومیاں گنگوہی

جمنا کا تازہ ریت، کو کلے، بالکل ہرا جھاؤ برآمد ہوا ہے جس سے اس علاقہ میں جمنا کا وجود ثابت ہوتا ہے علاقہ کے بڑے بوڑھے اس بات پر متفق ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ جمنا دریا گنگوہ کے پاس میں بہتا تھا غالبًا تاریخ میں جمنا کا یہاں پر بہنا اس لیے درج نہیں ہے کہ یہ قصبہ پنجاب اور دہلی کے درمیان واقع ہے۔ مغربی بیرونی حملہ آوروں کے بالکل راستے میں ہے جو بھی حملہ آور مشرق سے آیا وہ سرساوہ کی راہ سے آیا ہے اور درمیان کے قصبوں سرساوہ، نکوڑ، گنگوہ اور جلال آباد کو روندتا ہوا نکل گیا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے بہر کیف جب حملہ آور تھوڑے تھوڑے وقفے سے آتے رہے تو تاریخی یادداشتیں لکھنے کا کسے خیال آسکتا ہے۔ گنگوہ اور مضافات گنگوہ کے بڑے بوڑھوں کا بیان ہے کہ لال مسجد کی پشت پر بابا تاج الدین کے چلّہ پر جو برگد کا قدیمی درخت ہے یہ پیڑ ملاحوں کا وہ ''کھونٹا'' ہے جس میں وہ اپنی ناؤ کا رسّہ باندھتے تھے، اس زمانے میں جمنا پار جانے کا واحد ذریعہ صرف ناؤ ہی تھی۔ چونکہ برگد کی شاخ نمی پا کر برگ و بار لے آتی ہے چنانچہ برگد کا موٹا لٹھا برگ و بار لا کر چند سالوں میں ہی تناور درخت بن گیا جو آج تک موجود ہے۔ لال مسجد سے سرائے کو جاتے ہوئے تالاب کے جنوب میں حاجی بندو کی کھیتوں کی مینڈھ سے ملا ہوا، غیر آباد مقام پر طویل وعریض ایک گہرا کنواں موجود تھا۔ اس کنویں کو اکثر دیکھنے والے کہتے تھے نہ معلوم کس نے یہ کنواں غیر آباد جگہ پر کس لیے بنوا رکھا ہے۔ مگر کچھ سالوں پہلے تالاب کے درمیان والی سڑک سے جنوب میں جو حصۂ تالاب تھا۔ اس کو زمین کے ہموار کرایا گیا اور برائے فروخت اس کی پیمائش وحد بندی کی جانے لگی تو کنویں کے قریب ہی ایک لمبی اور چوڑی دیوار برآمد ہوئی۔ جس میں کئی ٹرک لکھوری قدیمی اینٹیں دستیاب ہوئیں تو تذکروں کی ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ یہ کنواں ملاحوں نے قلعۂ گنگ کے جنوب مغربی گوشہ کے قریب شہر پناہ کے باہر بنا رکھا تھا۔ جو یہاں ناؤ لیے ہوئے ہمہ دم جمنا کے گھاٹ پر موجود رہتے تھے۔ اور صاف وشیریں پانی کے لیے انھوں نے یہ کنواں اس لیے تعمیر کیا تھا کہ شہر پناہ کے تین دروازے عام طور پر بند رہتے تھے شہر میں آمد ورفت کے لیے صرف جنوبی دروازہ ہی دن میں وقتاً فوقتاً کھلتا تھا۔ جو مغربی دروازے سے کافی دور پڑتا تھا۔ جمنا نے اپنا بقیہ،

تالاب نہایت طویل و عریض چھوڑا ہوگا۔ چالیس سال پہلے پُل کے شمالی حصۂ تالاب کو پیلا، "تالانب" اور جنوبی حصہ تالاب کو "عام گڈھا" بولا جاتا تھا۔ تیسرا حصۂ تالاب، آبادی سے ذراہٹ کر جنوبی سمت میں میلوں رقبہ پر محیط ہے اور ڈابر جھیل کے نام سے مشہور ہے۔ اول الذکر دونوں تالاب آبادی ہو جانے کی وجہ سے ناپید ہو چکے ہیں۔ ہاں ڈابر جھیل ابھی بھی کافی بڑے رقبہ میں پہلے سے بہت کم موجود ہے۔ گویا گنگوہ میں جمنا کا بہنا اور موجودگی نیز یہاں سے اُس کا لکھنوتی سے آگے چلا جانا، آثار قرائن سے بھی لگتا ہے کہ ۱۵۲۶ء تک جمنا قلعۂ گنگ کے قریب کو بہتی تھی۔ حضرت شیخ عبدالقدوسؒ پہلے ردولی سے شاہ آباد پنجاب تشریف لائے پھر وہاں سے بھی جنگی مصیبت اور تباہ کاری کی بناء پر گنگوہ شریف رونق افروز ہوئے۔ مولانا رکن الدین لطائف قدوسی میں تحریر فرماتے ہیں کہ دارالسلام غارت ہو گیا۔ بابر نے برصغیر پر حملہ کیا تو بابر کی پیش قدمی کی خبر سنتے ہی شہری اور دیہاتی محفوظ مقامات کی طرف بھاگ گئے[1] حضرت اپنے متعلقین کے ہمراہ شاہ آباد سے گنگوہ چلے آئے۔ مغلوں نے شاہ آباد اور دیپال پور برباد کر دیے دیپال پور شاہ آباد کی طرح عالموں، فاضلوں اور صالحین کی زبردست آبادی والا شہر تھا۔ یہاں کئی مشہور مدارس اور بہت سے قیمتی کتابوں کے ذخیروں سے لبریز کتب خانے موجود تھے۔ بابر کے تاخت و تاراج کے وقت مولانا رکن الدین کے بقول "علماء و صلحاء بسیار کشتہ شد و کتب خانہا غارت شدند"[2]

قطب العالم حضرت شیخ عبدالقدوسؒ گنگوہ تشریف فرما ہوئے تو یہاں کے در و بام روحانیت کے نور سے جگمگا اٹھے۔ فضائے گنگوہ ایمانی ترنم سے مسحور و معمور ہو گئی۔ گویا ایک نیّر تاباں جلوہ نما ہو گیا تھا۔ جس نے کفر و الحاد کی منجمد تاریکیوں کو تحلیل کر کے یہاں کے گوشہ گوشہ کو دین متین، شرع مبین، شریعت و طریقت، معرفت اور حقیقت کی نورانیت سے معمور کر دیا تھا۔ اس آفتابِ چشتیہ صابریہ کی ضیا پاشیاں گنگوہ سے گزر کر عرب و عجم بلکہ تمام عالم کو منور کر گئیں۔ اور گنگوہ شریف کی مرکزیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

■■

---

[1] و [2] لطائف قدوسی، ص ۹۶، و لطائف قدوسی کی تاریخی حیثیت، ص ۶۱، از پروفیسر محمد اسلم لاہوری

شجرۂ قدوسیانِ گنگوہ شریف

حضرت قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے اجداد میں سے زوطی ملک فارس سے کوفہ میں آکر آباد ہوئے۔ اس وقت یہ مسلمان ہو چکے تھے۔ آپ کی نسل میں اسلام زوطی ہی کی بدولت آیا۔ آپ نے تابعی کا درجہ پایا۔ کوفہ میں ہی امام ابوحنیفہ کے والد ثابت پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کوفہ مسلمانوں کا دارالسلطنت اور علوم وفنون کا زبردست مرکز تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت تھی۔ زوطی اس نیک فال بچے ثابت کو امیر المومنین کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے جنھوں نے آپ کی اولاد کے حق میں علم وعمل کی دعاء فرمائی اور یہ دعا اتنی تیر بہدف ثابت ہوئی کہ سب سے پہلے امام ابوحنیفہ پھر آپ کی اولاد میں حضرت قطب جمال ہانسوی، حضرت شاہ بوعلی قلندر پانی پتی اور ہمارے قطب العالم حضرت شیخ عبدالقدوسؒ پیدا ہوئے۔ حضرت شیخ کے دس لڑکے پیدا ہوئے جن میں چھ عمر طبعی کو پہنچے یہ پانچ حضرت شیخ حمید الدین۔ حضرت شیخ علی حضرت شیخ محمد محدث حضرت شیخ عبدالسلام، حضرت شیخ مولانا رکن الدین گنگوہ میں مدفون ہیں اور یہ پانچ حضرت نظام الدین، حضرت قطب الدین، حضرت محی الدین، حضرت ابوسعید، حضرت شیخ احمد شاہ آباد پنجاب میں مدفون ہیں۔ شیخ احمد کا مزار شاہ آباد میں زیارتگاہ خاص وعام ہے۔ حضرت شیخ قطب العالم کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔[۱]

حضرت شیخ عبدالقدوس بن مولوی اسماعیل بن قاضی مخدوم صفی الدین بن خواجہ نصیر الدین بن خواجہ نظام الدین بن خواجہ آدم بن خواجہ ظہیر الدین بن خواجہ احمد بن خواجہ عبدالواسع بن خواجہ عبدالقادر بن خواجہ عبدالغنی بن خواجہ عثمان بن اسحاق بن عمر بن فضل اللہ بن نصیر الدین بن سعد الدین بن نجم الدین بن داؤد بن جعفر بن حامد بن خیر الدین بن امام طاہر بن امام ابراہیم بن امام احمد بن حضرت نعمان امام اعظم ابی حنیفہ بن ثابت بن حضرت زوطیؒ بن ہرمز بن نوشیرواں عادل والئی ملک فارس۔

---

۱ سیرت قدوسیہ۔ مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہی [illegible] ۱۴۱۱ھ

افغانوں کی گنگوہ سے بربادی

حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کی آمد اور یہاں آپ کے قیام پذیر ہونے کے بعد گنگوہ علوم نبوی اور علوم دینوی کا عظیم مرکز بن چکی تھی — قدوسیت اور انصاریت کے امتزاج حسین سے وہ فرحت بخش روح پرور چشمہ جاری وساری ہو چکا تھا کہ تشنگانِ علم وعمل دور دور سے آکر اپنی پیاس بجھا رہے تھے، مدارس، خانقاہیں، علمی، ادبی، ثقافتی اور اصلاحی ادارے بڑی تعداد میں قائم ہو چکے تھے۔ ذکر وشغل کی فضاؤں، تصوف وسلوک، رشد وہدایت، شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کا دور دورہ تھا — رہن سہن، لباس، چہروں مہروں سے دینداری ٹپکی پڑتی تھی ہر گھر ہر در سے حق، ہو کی صدائیں ماحول کو ایک ابدی سکون وطمانیت عطا کر رہی تھیں۔ شریعت وطریقت، معیشت ومعاشرت شانہ بشانہ چل رہی تھیں۔ گزرے لمحات کے ساتھ ساتھ یہاں افغانیوں کو رہتے ہوئے مدت مدید ہو چکی تھی۔ اس عرصہ میں ان کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی۔ اس لیے ان میں رعونت پیدا ہو گئی تھی۔ تعداد کی زیادتی، فوجی تلخی، اور طبعی سختی کی بنا پر وہ اہل گنگوہ پر حاوی ہو کر ان کو پریشان اور ان پر زیادتیاں کرنے لگے۔ خود کو اعلیٰ اور دوسروں کو حقیر ترین سمجھنے لگے تھے کہ اسی دوران قاضیٔ شہر مفتی امین الدین ابن خواجہ فرید الدین اور افغانیوں کے درمیان ایک شرعی مسئلہ میں بحث چل پڑی اور شدید اختلاف واقع ہو گیا۔ جس کے سبب افغانی مفتی صاحب کی ہلاکت کے درپے ہو گئے۔ مفتی صاحب حضرت قطب عالم کے ہم عصر اور ان کے زبردست معتقد وحاضر باش تھے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب سرائے حضرت قطب العالم کے یہاں پناہ گزیں ہو گئے لیکن بے ادب ومحروم افغانی وہیں پہنچ گئے۔ حضرت شیخ نے ان کو بہت منع کیا۔ مگر انھوں نے قتلِ ناحق کا گناہِ عظیم اپنے سر لے ہی لیا اور مفتی صاحب کو شہید کر دیا حضرت شیخ واقعۂ ناگہانی سے اس قدر رنجیدہ خاطر ہوئے کہ چہرۂ اقدس پر شدید غصہ کی وجہ سے سُرخی چھا گئی اور آپ رنج ومحن کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔

حضرت مفتی صاحب کے بڑے فرزند قاضی نظام الدین اپنے بڑے بیٹے ولی محمد کے

ہمراہ احتجاجاً ہرات کے لیے ہجرت کر گئے۔ مگر راستہ میں لاہور کے قریب ہمایوں بادشاہ سے ملاقات ہوگئی۔ جبکہ وہ افغانیوں سے شکست کھانے کے بعد دوبارہ واپس جنگ کے واسطے دہلی کی سمت آ رہا تھا۔ بادشاہ نے ان کے جملہ حالات سُن کر فرمایا "اگر خداوند کریم نے مجھ کو دوبارہ ہندوستان پر قابض کر دیا تو تم کو پھر اُسی جگہ آباد کروں گا۔ ورنہ میرے ساتھ رہنا۔ میں جہاں رہوں گا تم بھی وہیں رہنا۔" اور ان حضرات کو سمجھا بجھا کر واپس گنگوہ بھیج دیا۔ یہ حضرات گنگوہ آئے تو یہاں انھوں نے زبردست تبدیلی دیکھی۔ گنگوہ کی فضا اور ماحول کو افغانیوں کی چیرہ دستیوں سے بالکل محفوظ پایا۔ اور کئی مفسد و متشدد اڑیل افغانیوں کو یہاں سے غائب پایا۔ کسی کو مطلق معلوم نہ تھا کہ کمینہ خصلت افراد کہاں اور کب یہاں سے چلے گئے۔ انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ہاں گنگوہ میں اس وقت یہ شہرت عام تھی کہ چونکہ حضرت مفتی صاحب کا قتل ناحق ہوا تھا اور مفتی صاحب قطب العالم کو بہت عزیز تھے اور آپ ان کی شہادت پر نہایت کبیدہ خاطر تھے اس لیے ہوسکتا ہے بلکہ یہ قرین قیاس بھی ہے کہ حضرت شیخ عبدالقدوسؒ نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کر دیا ہو کہ افغانیوں کی دست بُرد سے گنگوہ والوں کو اللہ رب العزت محفوظ فرمادے۔ اور یہ گذارش اللہ کے قطب کی دربار الٰہی میں مقبول ہوگئی کہ ایک سال کے اندر ہی اندر گنگوہ شر ّی افغانیوں سے خالی ہوگئی اور ان کے عالی شان محل و مکانات خالی و ویران پڑے رہ گئے مدت تک یہ مکانات یونہی پڑے رہے۔ لوگ ان مکانوں میں رہتے تو کیا ان میں داخل ہونے سے بھی ڈرنے لگے کہ کہیں ہم بھی نہ ان کی ہی طرح برباد ہوں جائیں کہ یہ املاک ان لوگوں کی ہیں جن پر خدا کا غضب وارد ہوا تھا کہ انھوں نے ناحق ایک نیک و مخلص انسان کو ناحق قتل کر دیا تھا۔ اُس وقت سے آج تک اُس نسل کا گنگوہ میں کوئی افغانی موجود نہیں ہے۔ تغیر واتفاق دیکھیے کہ ہندوستان پر ہمایوں بادشاہ دوبارہ قابض ہوا[1] تو قاضی نظام الدین سے کیا ہوا وعدہ فراموش نہ کیا اور اپنے معتمد ہر کاروں کو گنگوہ بھیج کر قاضی نظام الدین کو تسلی بخش خط لکھا اور گنگوہ میں قیام کرنے کی تلقین کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ فرمان شاہی عطا فرما کر جاگیر میں موضع شیر مؤ، موضع کوٹڑہ اور موضع سالار پور دے کر آپ کی عزت افزائی فرمائی۔ یہ واقعہ ۱۵۵۵ء کا ہے۔

---

1 تاریخ ہندوستان، ص ۱۲۸

گنگوہ کا سب سے پہلا شاعر

گنگوہ شریف ایسا گلشن ہے جہاں رنگارنگ کے پھول اپنی مہک سے فضاؤں کو معطر کر رہے ہیں۔ ہر مذہب وملت کے افراد یہاں بھائی بھائی کی طرح مل جُل کے رہتے ہیں۔ یہاں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ بزرگوں اور صوفیوں کے عرس ہوتے رہتے ہیں۔ رشیوں، منیوں کے میلے لگتے رہتے ہیں۔ جن میں بلالحاظ مذہب وملت ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ ہولی، دیوالی، عید اور محرم کے جلوس کی تقریبات میں ہندو مسلمان مساوات اور بھائی چارہ کی بے مثال یادگار قائم کرتے ہیں۔ مشاعروں اور کوی سمّیلنوں میں سب لوگ یکساں شرکت کرتے ہیں۔ یہاں کی ادبی اور شعری محفلیں ادب نوازی اور ثقافتی تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ یہاں کے مشاعرے اور کوی سمّیلن ملک میں دور دور تک اپنی مخصوص بہتر ادبی وتہذیبی پہچان بنائے ہوئے ہیں۔ باہر کے شعراء ان محفلوں میں شریک ہونا باعث فخر تصور کرتے ہیں۔ گنگوہ میں شعروشاعری کا مستقل ماحول پندرہویں صدی سے ملتا ہے۔ کیونکہ حضرت قطب العالم کی فارسی اور ہندی شاعری اُس وقت منظرِ عام پر آچکی تھی۔ آپ کا ہندی تخلص الکھداس اور فارسی شاعری میں احمدی اور قدوس تخلص تھا۔ آپ کے کلام سے پہلے کسی کی شاعری کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہے اس لیے حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کو ہی یہاں کا اولین شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ آپ کی شاعری کا تذکرہ کئی ادبی کتابوں اور بزرگوں کے تذکروں میں ملتا ہے۔ مشہور شاعر وادیب اور نقاد تنویر علوی کیرانوی نے اپنی تاریخ ادب اردو کی کتاب ''تنویر ادب'' میں آپ کو ہند کے اولین دور کے شعراء میں شامل کر کے آپ کی شاعری پر بہترین تبصرہ کرتے ہوئے آپ کی شاعری کے محاسن بیان کیے ہیں۔ آپ کا فارسی و ہندی کلام کافی تعداد میں دستیاب ہے۔

■■

گنگوہ کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر

حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کے ہی خاندان کے ایک عاشق رسولؐ فرد مولانا شاہ حضرت ممتاز جہاں ممتاز قدوسی نہایت نغز گو اور زود گو شاعر تھے۔ اچھا شاعر اور اچھا انسان ہونے کے ساتھ ساتھ علم ظاہر، علم باطنی اور علم وادب شعرو نظم میں بھی یکتا تھے۔ پابند صلوۃ وصوم متقی انسان تھے۔ عشق رسولؐ کی وجہ سے نعتیہ شاعری میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ آپ کا نعتیہ کلام زبان زدِ خاص وعام ہے۔ جب عازمین حج بیت اللہ شریف ہوئے تو آنکھیں اشکبار اور دل پر بے قراری واضطراری کیفیت طاری تھی۔ اور سفر مدینہ میں تو قلبی اضطراب مزید تر ہو گیا اور جیسے ہی گنبد خضرا نظر آیا تو یکبارگی چیخ اٹھے ۔

محمد کا روضہ قریب آگیا ہے
بلندی پہ اپنا نصیب آگیا ہے

زیادہ تر آپ کا کلام نعتیہ ہے۔ چونکہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی اُنس ومحبت تھی اس لیے آپ کے نعتیہ اشعار میں ایک خاص کشش نظر آتی ہے اور ان کو پڑھتے وقت قلب پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور یہ ان کے عشق رسولؐ کا اثر ہے۔ پوربی زبان میں بھی آپ کا کلام بہت ہے غزلیات بھی اور نعتیں بھی۔ گنگوہ میں آپ سے پہلے کسی اور کا مطبوعہ کلام یا مطبوعہ دیوان دستیاب نہیں ہوا حالانکہ حضرت شیخ محمد صادق محبوب الٰہی آپ سے بہت پہلے شاعر ہیں آپ کا تخلص صیّاد تھا۔ مگر چونکہ آپ کا کلام و دیوان دستیاب نہ ہو سکا اس وجہ سے گنگوہ کا پہلا صاحب دیوان شاعر شاہ ممتاز جہاں کو ہی مانا گیا ہے آپ کے دیوان کا نام ''مناقبِ چمن'' اول و دوم وسوم ہے اور آج بھی موجود و دستیاب ہے۔

■■

گنگوہ کا پہلا مصنف

سرزمین گنگوہ کو مولانا شیخ رکن الدین خلف الصدق قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی پر بجا طور پر ناز ہے کہ انھوں نے گنگوہ کی عظمت میں چار چاند لگائے۔ علوم ظاہری وعلوم باطنی میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپ اپنے والد ماجد کے اجل خلیفہ اور حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی کے والد شیخ عبدالاحد سرہندی کے پیرومرشد ہیں۔ آپ عالم بے بدل، ولی کامل فضل اور کمال میں یگانہ، علوم ومعارف کے منبع مخرج تھے، آپ کے بارے میں حضرت شیخ خود فرماتے ہیں کہ "اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے سوال کیا کہ ہمارے لیے کیا لے کر آیا تو جلال الدین تھانیسری اور رکن الدین کو پیش کردوں گا[1]" مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی مولانا رکن الدین کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ سلسلۂ چشتیہ کے مشاہیر مشائخ میں سے ہیں[2] آپ دو کتابوں کے مصنف ہیں۔ اول لطائف قدوسی دوم مرج البحرین۔ لطائف قدوسی کی تاریخی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے متعدد مندرجات وواقعات خود حضرت قطب العالم کی زبان فیض ترجمان سے سنے ہوئے ہیں اور خود مصنف بھی بہت سے واقعات کے عینی شاہد ہیں، علاوہ ازیں حضرت شیخ کے ایک مخلص مرید دَتّو سروانی شیر شاہ کی فوج میں تھا۔ دَتّو ہمایوں اور شیر شاہ کی جنگوں میں شریک تھا۔ اور وہ ہمایوں و بہادر شاہ گجراتی کی جنگ کے دوران گجرات میں مقیم تھا۔ اس نے شیخ رکن الدین کو ان جنگوں کے بارے میں ایسی معلومات بہم پہنچائی جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔ لطائف قدوسی میں اُس عہد کی اہم اور نامور ہستیوں کا ذکر ہے۔ اِس لیے اس کو اُس عہد کی تاریخ کا مستند اور اہم ماخذ سمجھنا چاہیے۔ حضرت شیخ کے ملفوظات کی ترتیب و تدوین کے وقت مولانا رکن الدین کی عمر سینتالیس سال تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک پختہ ذہن کی تصنیف ہے۔ ہماری ناقص رائے میں لطائف قدوسی کا حوالہ دیے بغیر اُس دور کا

---

[1] سیرت قدوسیہ، ص ۱۷ [2] نزہت الخواطر ص ۱۹۹، وص ۲۷۰ جلد ۴، مطبوعہ حیدرآباد، ۱۹۵۴ء

تذکرہ یقیناً نامکمل رہے گا۔[1] لطائف قدوسی اُس دور کی روایت کے مطابق فارسی زبان میں ہے کیونکہ سرکاری زبان فارسی تھی تاہم لطائفِ قدوسی کی زبان و بیان نہایت سادہ، رواں اور سلیس ہے۔ واقعات وملفوظات نہایت بلیغ انداز اور پوری دیانتداری کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔ عبارت بامحاورہ اور صاف ہے۔ استعارہ وکنایہ وتلمیحات برمحل ہیں جن سے مفہوم کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ سلوک وتصوف کی اصطلاحات بعید از فہم بالکل نہیں۔ لطائف قدوسی لودھیوں کے آخری اور مغلوں کے ابتدائی دورِ حکومت کا اہم ومستند ماخذ ہے۔ اس کتاب سے استفادہ کے بغیر لودھیوں کے زوال اور مغلوں کے ابتدائی دور کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ یہ کتاب ابتدائے جمادی الاول ۹۴۴ھ میں لکھی جانے لگی اور ماہ شعبان المعظم ۹۴۴ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ حضرت قطب العالم نے قریباً گیارہ کتابیں تحریر کیں۔ مگر وہ سب گنگوہ آنے سے پہلے کی تحریر کردہ ہیں یہاں آ کر کوئی کتاب نہیں تصنیف کی۔ اس لیے اُس دور کے سب سے پہلے مصنف مولانا رکن الدین کو ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

گنگوہ کا پہلا محدث، فقیہہ اور شاہی جج

حضرت مولانا شیخ عبدالنبی نعمانی قدوسی گنگوہی اپنے وقت کے شیخ الاسلام، متبحر عالمِ دین، فقیہہ وقت، بلند پایہ مصنف، محدث اکبر علوم وفنون کے ماہر، عارف باللہ، متقی بزرگ تھے۔ ہندوستان کی مشہور عالم ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ شرح اسماء الحسنیٰ، معارف وحقائق پر مبنی نادرالوجود تصنیف ہے اور سنن المصطفیٰ علم حدیث پر لاجواب اور مستند کتاب ہے آپ کی اس تصنیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا حدیثِ پاک میں بہت بلند مقام ہے۔ زیارت حرمین شریفین کا کئی بار شرف حاصل کیا۔ اور وہاں بڑے بڑے علماء سے حدیث پاک کا علم حاصل کیا۔ گویا گنگوہ نویں صدی ہجری میں ہی حدیث وفقہ سے مشرف ہو چکی تھی۔ آپ شیخ احمد کے فرزند اور حضرت قطب عالم کے پوتے ہیں خاندانی رسم عرس

---

[1] لطائف قدوسی کی تاریخی اہمیت، ص ۳۴ = محمد اسلم لاہوری

وجد وسماع میں قوالی معہ مزامیر وغیرہ کو خلاف کتاب وسنت اور بدعت سمجھتے تھے، مگر آپ کے والد احمد اعراس وسماع ووجد کو بہ تاکید بجالاتے تھے، آپ ان امور میں اہل خاندان اور والد کی مخالفت فرماتے تھے کیونکہ آپ خالص کتاب اللہ اور سنت رسول ؐ پر عامل تھے اور اسی کے داعی۔ اور یہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ والد ماجد اور اہل خاندان نے شیخ عبدالنبی کو بڑی اذیتیں پہنچائیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وطن ہی سے نکال دیا۔ چنانچہ آپ دہلی تشریف لے گئے۔ اُس وقت سلطان جلال الدین محمد اکبر کا اوّلین دورِ حکومت تھا۔ اس وقت اکبر بادشاہ علماء، صلحاء، فقہا حکماء اور بزرگوں کا نہایت اکرام واحترام کرتا تھا۔ اور ان کا زبردست قدردان تھا۔ یہ دور اس کا عملی لحاظ سے اعلیٰ کردار کا حامل تھا۔ اکبر بادشاہ اُس وقت علماء کا متلاشی رہتا تھا۔ جب اس کو حضرت شیخ عبدالنبی کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے شیخ کو بُلا بھیجا اور اپنے یہاں اُس دور کا سب سے بڑا عہدہ ''صدارت عظمیٰ'' کا منصب جلیل پیش کیا۔ آپ پورے ہندوستان میں سب سے بڑے قاضی، قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس بنادیے گئے۔ مغل بادشاہ اکبر نے آپ کا اس قدر احترام واعزاز کیا کہ انتہا ہوگئی۔ کہ شیخ عبدالنبی سے حدیث شریف سننے کے لیے آپ کو اپنے گھر طلب نہیں کیا بلکہ خود ان کے مکان پر جاکر احادیث اور دینی علوم ومسائل سے واقفیت حاصل کرتا۔ اور شیخ کے یہاں حاضری کو اپنے لیے سرمایۂ سعادت تصور کرتا۔ شیخ کی جوتیوں کو سرمایۂ افتخار جانتا اور ان کو سیدھی کر کے رکھتا۔ ہر وقت شیخ کے اشارہ کا منتظر رہتا۔ جیسا فرمادیتے ویسے ہی کرتا۔ رفعت، عظمت، فراست، علم وعمل، فضل وکمال اور مارت کے اعتبار سے بھی آپ اُس وقت دہلی میں بے تاج بادشاہ تھے، اس وقت کے مشہور دیانتدار مورخ عبدالقادر بدایونی تحریر کرتے ہیں کہ شیخ عبدالنبی تقویٰ، طہارت شرافت، عبادت اور ظاہری اشغال کی وجہ سے ہر عام خاص کے دماغوں پر حاوی تھے۔ پورے ہندوستان میں ہر طور پر آپ کا طوطی بول رہا تھا۔ آپ کا اقبال پورے عروج پر تھا۔ کہ ابوالفضل اور فیضی جیسے منافق، فتنہ پرور آپ کے عروج سے جل اٹھے اور آپ ان کی ریشہ دوانیوں کے شکار ہوکر پریشانیوں میں مبتلا ہوئے۔[1] آپ نے دو مسجدیں تعمیر کرائی۔ ایک آئی، ٹی، او، دہلی میں مسجد

[1] نزہت الخواطر، ص ۱۹۶، جلد ۴، و ص ۱۹۷، جلد ۷

عبدالنبی کے نام سے۔ جہاں آج کل جمعیتہ العلماء کا دفتر ہے۔ دوسری مسجد عبدالنبی سرائے گنگوہ میں۔ گلشن انار کے درمیان۔ جس میں مدرسہ عربیہ رشیدیہ ہے۔ اس قطعہ کو انارکلی کہا جاتا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حاسدین نے آپ کو دہلی میں قتل کرادیا تھا۔ مگر آپ کا مرقد و مزار قصبہ اندری ضلع کرنال ہریانہ میں شاہ ولایت کے نام سے زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اندری اور شاہ آباد میں اُس وقت آپ کے برادر اور خاندانی بڑی تعداد میں آباد تھے ——— دراصل حضرت قطب العالم شیخ عبدالقدوسؒ کا اصلی وطن قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی ہے۔ آپ یہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے اسی قصبہ میں آپ کا خاندان اور پیر بھی ہیں۔ جب سلطان بہلول لودھی کا بیٹا تخت نشین ہوا تو ہندوستان کے بہت سے شہروں اور قصبوں میں کفار کا غلبہ ہوگیا۔ کھلے عام بازار میں خنزیر کا گوشت بکنے لگا تو حضرت کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ عمر خاں جو آپ کا تعلق دار تھا اس کی درخواست پر آپ شاہ آباد پنجاب ردولی سے تشریف لے آئے اور قریباً پینتیس سال یہاں سکون کے ساتھ گزارے۔ تمام اولاد یہیں پیدا ہوئی، پانچ لڑکے شاہ آباد میں مدفون ہیں اور پانچ لڑکے گنگوہ میں حضرت کے قریب ہی آرام فرما ہیں۔ حضرت شیخ عبدالنبی کے والد ماجد حضرت شیخ احمد کا مزار مبارک شاہ آباد میں ہی ہے۔ بابر نے جب ہندوستان پر حملہ کیا اور وہ پانی پت میں ابراہیم لودھی سے لڑائی کے لیے آیا تو اس کی فوج نے شاہ آباد اور اس کے مضافات کو بُری طرح تباہ و برباد کیا، اس سے کچھ قبل آپ گنگوہ تشریف لا چکے تھے مگر آپ کی بیشتر اولاد پنجاب کے شہروں اور قصبوں میں آباد رہی۔ شاہ آباد، دیپال پور، تھانیسر، پیپلی، رادور، اندری، کرنال وغیرہ میں قدوسی احمدی یعنی شیخ احمد کی اولاد خوب پھول پھل رہی تھی۔ جب شیخ عبدالنبی کا قضیہ حاسدین نے دہلی میں اٹھار کھا تھا اور آپ کو ناحق پھنسا رکھا تھا اور حالات متوقع تھے کہ آپ کا بچنا محال ہے تو آپ کے اہل خاندان آپ کے حالات سے ناواقف و غافل نہیں تھے، آپ کے قتل کے بعد آپ کی میت آپ کے خاندان والے اندری لے آئے اور یہیں آپ کو دفن کیا گیا۔ آپ کے اہل میں سے اندری میں پیر[1] جی محمد یوسف صاحب ثروت و باعظمت اہل علم وعمل افراد میں سے ایک تھے۔ آپ کا انتقال غالباً ۹۹۱ھ میں ہوا۔

---

[1] پیر جی محمد یوسف قدوسی میرے تائے قاضی فہیم الدین ایوبی گنگوہی کے خسر تھے۔ نسیم انور ایوبی گنگوہی

گنگوہ کا دوسرا صاحبِ دیوان شاعر

حضرت شیخ عبدالقدوسؒ گنگوہ کے پہلے شاعر ہیں اور ممتاز جہاں ممتاؔز قدوسی (مناقب چمن) پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ ممتاز جہاں قدوسی کے بعد چار سو اکسٹھ (۴۶۱) سال تک یہاں کسی شاعر نے اپنا مجموعۂ کلام شائع نہیں کرایا غالباً یہاں کے شعراء نے نام ونمود کو کبھی مطمحِ نظر نہیں بنایا۔ مگر اس نام ونمائش کے چکر کی وجہ سے ادبی وشعری سرمایہ کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ یہاں کے قدیم وجدید دور کے شعراء کی بڑی طویل فہرست ہے، مرحومین شعراء کا کلام ان کے بعد ان کے گھروں میں ان کی اولادوں کے پاس یا تو دیمک چاٹ گئی یا بے پروائی کی نذر ہو کر تلف ہو گیا۔ اب باوجود تلاش وجستجو کے بھی اُن حضرات کا کلام ہاتھ نہیں آتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسے نادر علمی ورثہ کی حفاظت کی خاطر اس کو منضبط کر کے شائع کرایا جانا ضروری ہے۔ جن حضرات کے پاس ان کے بزرگوں یا ان کے عزیزوں کا کلام موجود ہو تو وہ اس طرف توجہ فرمائیں۔ خود شائع نہ کرا سکتے ہوں تو کسی اچھی، مستند اور فعال لائبریری کو یہ ادبی سرمایہ مرحمت فرما دیں۔ کیونکہ شاعری فنونِ لطیفہ کے شمار میں آتی ہے۔ یہ ایک وہبی، قدرتی، تخلیقی عمل ہے خود بخود آتی ہے سیکھنے اور کسب سے نہیں آتی۔ بلکہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی گئی علمی عطا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو ''شاعری جز ویست از پیغمبری'' کہا گیا ہے اور شاعر کو تلمیذ الرحمٰن۔ شاعری بالفعل بُری شئے نہیں مگر وہ تضیع اوقات کا ذریعہ نہ ہو بلکہ برائے اصلاحِ معاشرہ ہو۔ شاعری میں قوموں کا عروج وزوال، آزادی وانقلاب پنہاں ہوتا ہے۔ حدیث پاک میں بھی ہے۔ ''**اِنَّ الشعر لحکمة** '' اگر شاعری کو ''اِلْہَامْ'' سے تعبیر کر دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا بلکہ وہ الہام نہیں کچھ اور چیز ہے، شعر خود بخود بلا قصد ہو جاتا ہے۔ قصداً کہا نہیں جاتا۔ آمد کا شعر دلنشیں اور معنی آفریں ہوتا ہے مگر آورد یعنی قصداً کہا ہوا شعر زیادہ بہتر نہیں ہوتا اس میں

موزونیت اور شعریت تو ہوتی ہے مگر معنویت کم ہوتی ہے۔ شاعر جس قدر تعلیم یافتہ ہوگا، مضمونِ شعر اتنا ہی وقیع اور بہتر ہوگا۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہمارے یہاں بیش قیمت شعری ورثہ گھروں میں بے یارومددگار پڑا ہوا ہے اور برباد ہو رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے گنگوہ کے کئی شعرا کا کلام ضایع اور برباد ہو چکا ہے۔ اگر اس متاعِ بے بہا کی حفاظت نہ کی گئی تو بہتر اور کارآمد تخلیقات ضائع ہوتی رہیں گی۔ قابل مبارکباد ہیں وہ اشخاص جنھوں نے اس طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی۔ بہرکیف گنگوہ کا دوسرا صاحبِ دیوان شاعر، یوں تو محلہ ٹانکان کے ڈاکٹر جلال الدین شارب گنگوہی کو کہا جانا چاہیے۔ کیونکہ ان کا مجموعۂ کلام ۱۹۸۰ء میں لاہور پاکستان سے شائع ہو چکا ہے۔ ''فکروخیال'' کے نام سے۔ مگر چند حضرات کا اعتراض ہے کہ ڈاکٹر جلال الدین شارب ۱۹۳۳ء سے لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ اور قریباً ساٹھ سال سے ان کی ادبی، شعری، علمی، ثقافتی، فنی، معاشی، معاشرتی اور رہائشی سرگرمیاں پاکستان سے متعلق ہیں۔ اس لیے اب ان کو پاکستانی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پیدائش کے لحاظ سے وہ یقیناً گنگوہی کہے جانے کے ضرور مستحق ہیں لیکن گنگوہ کا دوسرا صاحبِ دیوان شاعر اُن کو کہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ جب وہ یہاں اب قیام پذیر ہی نہیں ہیں —— اب گنگوہ کا دوسرا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا اصل حقدار نیّر قریشی گنگوہی کا نام ہے۔ نیّر قریشی کا مجموعۂ کلام ۱۹۸۷ء میں ''نمودِ سحر'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ دوسرا مجموعۂ کلام ۱۹۹۱ء میں ''خواب دریچہ'' بھی شائع ہو چکا ہے اور تیسرا دیوان مرتب ہو چکا ہے اور جلد ہی زیور طبع سے مرصع ہونے جا رہا ہے۔ نیّر قریشی گنگوہ شریف کے مایہ ناز، صاحب طرز، زود گو، کہنہ مشق شاعر ہیں، گنگوہ کی شعری محفلوں کے روح رواں اور مقبول خاص وعام فرد ہیں۔ ملک اور بیرون ملک کے معیاری مقتدر اخبارات ورسائل میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ اکثر ریڈیائی مشاعرے بھی پڑھتے رہتے ہیں —— نیّر قریشی گنگوہی کے بعد آپ کے ہونہار فرزند عمران عظیم علیگ ایڈوکیٹ کا پہلا مجموعۂ کلام ''کمند حرف'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا، اور دوسرا مجموعۂ کلام ''رنگ صدا'' ۱۹۹۷ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔ عظیم قریشی گنگوہی جدید لب ولہجہ کے نوجوان معروف شعراء کی

صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔ مشہور اور معیاری اخبارات ورسائل کے صفحات پر آپ کا کلام شائع ہوتا ہے، عمران عظیم بیگ وقت وکیل، شاعر، نثر نگار اور اس دور کے اچھے نقاد ہیں، بہت سے رسائل کے قانونی مشیر ہیں۔ اس وقت تک گنگوہ کے صاحب دیوان شعراء کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ ممتاز قدوسی، نیّر قریشی، جلال الدین شارب، عمران عظیم قریشی اور حکیم قمیش احمد کیف قدوسی۔

گنگوہ شریف کے قدیم وجدید شعراء

محلّہ محمد غوری

	نام	تخلص
۱	منشی محمد اسماعیل	اسماعیلؔ
۲	محمد یامین	یامینؔ
۳	شوکت علی	شوکتؔ
۴	محمد نسیم ایوبی	انورؔ
۵	مترسین بھٹناگر	مترؔ
۶	ڈاکٹر منور نعیم ایوبی	منورؔ
۷	ماسٹر محمد یسین	اکرمؔ
۸	ماسٹر پرتاپ سارنگ	آذرؔ
۹	مستری شبیر احمد	شبیرؔ
۱۰	حافظ محمد انعام	حافظ

محلّہ اشرف علی

	نام	تخلص
۱	فاروق طاہر	برقؔ
۲	محمد شائق	شائقؔ
۳	محمد عمران	عمرانؔ
۴	ملا عبدالرحمٰن	خیالؔ
۵	منشی محمد قاسم	لاعب

نام	تخلص
حاجی حسام الدین	حسامؔ
مولوی محمد شاہ	حافظؔ
مولوی عبدالسلام	سلامؔ

محلّہ اشرا

نام	تخلص
دلیپ سنگھ	خنجرؔ
آسارام مہتہ	عاصیؔ
رام کرشن گویل	راموؔ
دنیش کمار	جوہر

محلّہ چھتہ

	نام	تخلص
۱	منشی مولہڑ سنگھ	نسیمؔ
۲	بندو حلوائی	بندوؔ

محلّہ نیم تلہ

	نام	تخلص
۱	پٹواری محمد ابراہیم	ابراہیمؔ
۲	منشی ظہور احمد	عاجزؔ
۳	سیّد اختر حسین	اخترؔ
۴	سیّد مظہر حسن	مظہرؔ

۴	مقصود احمد	تمنا
٦	ارشد مسعود	ارشد
۷	پٹواری حشمت اللہ	عاصی

محلہ ٹانکان

۱	عبدالغنی	بلبل
۲	داروغہ محمد حسن	حسن
۳	ڈاکٹر جلال الدین	شارب
۴	دیوان نظیر احمد	نظیر
۵	منشی رمضانی	جان جاناں
٦	منشی عبدالمجید	مجید
۷	منشی عبدالکریم	کریم
۸	محمد اختر	عاجز
۹	محمد ابراہیم	ابراہیم
۱۰	بندو حسن	بندو

محلہ قریشیان

۱	منشی غلام محمد قریشی	زائر
۲	سعید احمد قریشی	نیر
۳	محمد یونس قریشی	رہبر
۴	عمران عظیم قریشی	عظیم
۵	محمد احسان قریشی	افسر
٦	محمد یسین	ادیب
۷	مولانا دلشاد	ثاقب

محلہ غلام صابر

۱	منور علی	خنداں
۲	مولوی حافظ محمد یوسف	یوسف
۳	منشی فدا حسین	فدا
۴	حافظ مشتاق احمد	مشتاق
۵	صوفی عبدالحمید	عابد
٦	انعام الحق	بسمل
۷	ظہیر اختر	ظہیر
۸	انور صابری	انور
۹	محمد فاروق	فاروق
۱۰	متین چشتی	متین
۱۱	منصور احمد	حسرت
۱۲	محمد یوسف	نظر

محلہ غلام اولیاء

۱	محمد یونس	کوثر
۲	حافظ محمد حنیف	قمر
۳	سلیم احمد	سلیم
۴	خواجہ احمد چشتیؒ	احمد

محلہ بہاؤالدین

۱	فضل حق	لاعب
۲	محمد ظفر	ظفر
۳	منشی دلدار خاں	طرار
۴	مفتی محمود حسن	محمود

۵	داروغہ محمد الیاس	الیاس
۶	حافظ عبدالوحید	وحید
۷	مولوی محمد اصغر	اصغر
۸	مولوی محمد انور	انور
۹	مولوی محمد سرور	سرور
۱۰	وسیم احمد	مصوّر
۱۱	نسیم بانو	نکہت
۱۲	محمد نعیم	عظمت
۱۳	شاہد حسن	شاہد
۱۴	سعید احمد	سعید
۱۵	اکرام الحق	ناز

۱ **محلہ کوٹلہ**

۲	مقصود احمد قدوسی	مقصود
۳	داروغہ مستجاب احمد قدوسی	مستجاب
۴	مختار احمد قدوسی	مختار
۵	ثواب احمد قدوسی	ثواب
۶	اقبال احمد قدوسی	اقبال
۷	مولوی شمس الدین	شمس
۸	حافظ رحم الٰہی	دلکش
۹	ڈاکٹر محمد راشد	راشد
۱۰	ڈاکٹر شمس الدین	شوخ
	محمد راشد	کمال

محلہ مبارک علی

۱	حضرت شیخ محمد صادق	صیاد
۲	حکیم محمد اسماعیل	اسماعیل
۳	حکیم محمد یوسف	یوسف
۴	سید مسعود احمد	مسعود
۵	سید ارشاد احمد	ارشاد
۶	راضیہ قدوسی	راضیہ
۷	سید کلب عباس	نصرت
۸	رئیس احمد	عاصم

محلہ الٰہی بخش

۱	قطب عالم شیخ عبدالقدوس	احمدی قدوسی الصمدی
۲	ممتاز جہاں	ممتاز
۳	اعجاز جہاں	اعجاز
۴	حکیم تمیش احمد	کیف
۵	برہان الحق	شیدا
۶	ظہور الحق	ظہور
۷	قدیر الحق	قدیر
۸	درویش احمد	درویش
۹	مودود جہاں	مودود
۱۰	حکیم قریش احمد	قریش
۱۱	سید خادم حسین	خادم
۱۲	محمد عمر	مسیحا
۱۳	مولانا محمد اسماعیل	ذبیح

۱۴	حکیم عبدالرشید	محمود
۱۵	حکیم شفیق احمد	حاذق
۱۶	مولانا اعجاز الحق	اعجاز
۱۷	حامد فاروقی	حامد
۱۸	صوفی بشیر احمد	حالی
۱۹	صفیہ قدوسی	صفیہ
۲۰	شمیم اکرم	اعظم
۲۱	صفی الدین	صفی
۲۲	نسیم انور	آزاد
۲۳	محمد مکرم	مکرم
۲۴	محمد شعیب	شعیب
۲۵	مقصود احمد	شاداں
۲۶	شاہ محمد اشفاق قدوسی	اشفاق
۲۷	ڈاکٹر یوسف رشید	عرشی
۲۸	ڈاکٹر عارف رشید	عارف
۲۹	شاکر حسن	نازاں
۳۰	شاد احمد	شاد
۳۱	نوشاد احمد	نوشاد

شجرہ انصاریان (شیخ زادگان) قصبہ گنگوہ شریف

سیدنا حضرت خالد ابوایوبؓ انصاری، خواجہ ایوب، خواجہ ابومنصور مت، خواجہ جعفر، خواجہ علی، خواجہ احمد، خواجہ محمد، خواجہ ابی معاذ، خواجہ امام ابومحمد آخون، خواجہ شیخ الاسلام عبداللہ، خواجہ ہاشم بزرگ، خواجہ منہاج الدین، خواجہ تاج الدین، خواجہ شرف الدین، خواجہ رکن الدین، خواجہ محمد کبیر، خواجہ عبدالحمید، خواجہ شرف الدین، خواجہ نجم الدین، خواجہ رکن الدین، خواجہ علاء الدین، خواجہ محمد ہاشم:

خواجہ محمد فاضل

- خواجہ فریدالدین
  - خواجہ امین الدین عرف امن
    - خواجہ عبدالغنی
    - خواجہ عبدالحلیم
    - خواجہ عبدالحمید
    - خواجہ محمد کبیر عرف نظام الدین
  - خواجہ محمد محسن عرف بکھن
    - خواجہ عبدالرحمن
    - خواجہ فضل اللہ عرف فجو
    - خواجہ عبدالفتاح
    - خواجہ عبدالسبحان
    - خواجہ عبدالواسع
    - خواجہ عبدالشکور
- خواجہ فضل اللہ
  - خواجہ امیر الدین عرف راجن
    - خواجہ شرف الدین
    - خواجہ شفیق الدین
    - خواجہ رفیع الدین
    - خواجہ شفیع الدین
    - خواجہ ظریف الدین
  - خواجہ شرف الدین عرف ملک
    - خواجہ محمد یوسف
    - خواجہ محمد یونس
    - خواجہ عبدالقیوم
    - خواجہ محمد ہاشم
    - خواجہ محمد اسماعیل عرف علی اکبر
    - خواجہ شیخ سلطان عرف چھجو

شجرۂ محمد نسیم انورؔ ایوبی

خواجہ امیر الدین عرف راجن

↓

خواجہ شفیق الدین
↓
شیخ نور محمد
↓
شیخ منیر اللہ عرف خیراتی
↓
شیخ منشی اللہ دیا زوجہ اُمۃ خاتون بنت محمد یعقوب
↓
شیخ فخر الدین زوجہ حُسن الٰہی بنت نور محمد
↓
محمد نسیم انورؔ ایوبی

خواجہ ظریف الدین
↓
شیخ سعید الدین
↓
شیخ ابو محمد
↓
شیخ محمد ایوب
↓
شیخ الٰہی بخش
↓
شیخ حبیب حسن
↓
شیخ وزیر احمد
↓
شیخ محمد یعقوب
↓
اُمۃ خاتون منکوحہ منشی اللہ دیا
↓
محترمہ دادی نسیم انورؔ ایوبی

خواجہ شرف الدین
↓
شیخ کمال محمد
↓
شیخ جان محمد
↓
شیخ محمد جمیل
↓
شیخ محمد اکبر
↓
شیخ حافظ محمد
↓
شیخ لطف اللہ
↓
شیخ احمد بخش
↓
شیخ امام بخش
↓
شیخ محمد حسن
↓
اُم الٰہی منکوحہ شیخ نور محمد عرف نوری چوکیدار
↓
محترمہ نانی نسیم انورؔ ایوبی

خواجہ شرف الدین عرف ملک
↓
شیخ سلطان عرف چھجو
↓
شیخ قطب اللہ
↓
شیخ اکرام الحق
↓
شیخ محمد اسلم عرف ہاشم
↓
شیخ صلاح الدین عرف صلوا
↓
شیخ امام بخش
↓
شیخ عطا حسین
↓
شیخ نور محمد عرف نوری چوکیدار
↓
حسن الٰہی منکوحہ فخر الدین بن منشی اللہ دیا

شہر مارب اور قصرِ غمدان کی برآمدگی

قرآن پاک کے بہت سے قصوں کو مشتبہ سمجھنے والوں کی ہمارے یہاں اور دوسرے ملکوں میں کمی نہیں ہے۔ مگر جیسے جیسے کمپیوٹر سائنس بڑھتا جارہا ہے۔ قرآن پاک کی حقانیت کا اعتراف بڑھتا جارہا ہے چنانچہ دو فروری ۱۹۹۲ء کو صحرائے عرب میں مغربی ماہرین آثار قدیمہ کی ایک ٹیم نے سائنسی آلات کی مدد سے ریت کی نہایت گہری تہوں سے ایک شہر کو برآمد کیا ہے۔ قرآن کریم نے جس ریگستان کو زبردست ترقی یافتہ قوم کی آماجگاہ قرار دیا تھا وہ کوئی من گھڑت قصہ نہیں تھا بلکہ ایک تاریخی حقیقت تھی اس نئے شہر کی برآمدگی سے جو تازہ تحقیقات منظر عام پر آئی ہیں اُن کے ذریعے اس شہر کو قرآن پاک کا ذکر کردہ ''عرم'' تسلیم کیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن پاک ہی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جس نے یہاں کے آباد لوگوں اور اس شہر کا واقعہ بیان کیا ہے اور کسی مقدس کتاب توریت، زبور اور انجیل میں یہ ذکر نہیں ملتا۔ رسولؐ برحق نے کبھی اس علاقہ کا سفر نہیں کیا۔ وہ کیا ایسے شہر کے بارہ میں اپنے طور پر اطلاع دیتے کہ جو زمین کے نیچے ریت کی بے پناہ تہوں میں مدفون تھا اور جسے ہزاروں سال پہلے تباہ کیا جا چکا تھا۔ بیشک یہ اللہ تعالیٰ کی ہی ذات مقدس ہے جس نے محبوب بندے اور پیغمبر کو حقیقت حال سے مطلع فرمایا۔ اب سے ساٹھ سال پہلے برطانوی سیاح برٹرم تھامس اس علاقہ کے پاس سے گزرا تھا۔ اس نے یہ ریگستان اونٹوں کے ذریعہ پار کیا تھا۔ اور ''شعر'' کے چشمے کے قریب ایک لال قلعے کے آثار نظر آتے تھے بیتِ کثیر نامی قبیلے کے بدوؤں کی معیّت میں اس نے یہ ریگستان جس رستے سے طے کیا تھا اس کا نام اس نے ''راہِ عبار'' اپنے سفرنامے میں تحریر کیا ہے۔ دراصل مقامی آبادی میں یہ علاقہ ہمیشہ سے قوم عاد سے موسوم رہا ہے۔ یہیں ایک مقام حضرت موت ہے۔ جہاں ایک جگہ پر ایک قبر حضرت ہود علیہ السلام کے مزار کے نام سے مشہور ہے اور وہاں ہر سال ۱۵ ؍شعبان المعظم کو عرس ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں اس مہم کو سر کرنے کا سودا، لاس انجیلز کے ایک فلم ساز کے سر میں

پیدا ہوا تھا جس کا نام نکولس کلاپ تھا۔ لیکن ذرائع، وسائل کی نافراہمی اس کے ارادے میں رکاوٹ بنی رہی۔ پھر جنگ خلیج کی آفت سر پہ آ گئی۔ اس دوران خلائی شٹل چیلنجر سے جو تصویریں موصول ہوئیں ان کے تجزیہ سے معلوم ہوا کہ دشتِ عرب کی گہرائیوں میں ''ربع الخالی'' کے مقام پر کسی تباہ شدہ بستی اور اس کی سڑکوں، گلیوں کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ خلائی شٹل کی انفراریڈ شعاعوں نے جو تصویریں حاصل کی تھیں۔ اس سے قدیمی کاروانی رہگذار صاف نظر آرہے تھے۔ حالانکہ سطح زمین پر ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ لہٰذا عبار کی دریافت کی مہم نے پھر زور پکڑ لیا تھا۔ خلائی شٹل کی تصویریں دیکھ کر عمان کے سلطان قابوس نے اس علاقہ میں کھدائی کرنے کی اجازت دے دی۔ سلطان اور مسقط کی کچھ فرموں نے اس مہم کے اخراجات کا ذمہ لے لیا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۹۱ء میں برطانوی مہم جو سر رانیلف فینس کی سرکردگی میں قدیم نقشوں، خلائی اور آثار قدیمہ کی رپورٹوں، راڈار جیسے سائنسی آلات کی موجودگی میں کام شروع ہو گیا۔ ٹیم کے ایک ممبر جارج کہتے ہیں کہ ہم پر یہ احساس طاری ہوا کہ ہم نے مٹی میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ آخرش فروری تک مسلسل کھدائی کے بعد ہماری محنت کا ثمرہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ جنوبی عمان کی راجدھانی سلالہ سے صرف سو (۱۰۰) میل دور شمال کی جانب ایک قدیم تہذیب کے آثار ظاہر تھے۔ یہ قوم سبا کی ثقافتی بلندیوں اور فنی ترقیوں کی نشانی تھی۔ ''عادِ عرم والا شہر عبار'' قوم عاد کی تاریخی حیثیت اور ان کی تاریخ کا محل وقوع اب مستند ہو گیا ہے۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر عاد عرم کے نام سے آیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ طوفان نوح کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس قوم کو عروج بخشا وہ قوم عاد تھی۔ اِن کا مسکن احقاف کا علاقہ تھا۔ جو حجاز و یمن اور یمامہ کے درمیان ربع الخالی کے جنوب میں واقع ہے۔ حقف ریت کے لمبے لمبے اور اونچے اونچے ٹیلوں کو کہتے ہیں۔ یہاں ایسے ہی پہاڑ پائے جاتے ہیں جن میں جگہ جگہ سفید سفوف جیسی ریت کے ایسے سفید قطعے پائے جاتے ہیں کہ اگر کوئی چیز ان میں گر جائے تو ڈوبتی ہی چلی جائے اور کچھ ہی دیر میں گل کر ریت میں مل جائے۔ انھیں ریگزاروں میں ایک انگریز بحری افسر جیمز ویل اسٹیڈ کو ''حصن غراب''۔ کے مقام پر ۱۸۳۷ء میں ایک کتبہ ملا تھا۔ جس پر حضرت

ہود علیہ السلام کا بھی ذکر درج تھا۔ حضرت ہودؑ قوم عاد کے پیغمبر تھے۔ حضرت ہودؑ کو عام طور پر عابر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور عبار انھیں کے نام سے منسوب ہے۔

قوم سبا یا قوم عاد اپنی عمارتوں کی طرز تعمیر، باغات، خوشحالی اور ثروت کے لحاظ سے سارے عالم میں مشہور تھی۔ ماہرین نے عبار کے کھنڈروں میں ایک ایسی عمارت دریافت کی ہے جو آٹھ کھمبوں پر قائم ہے۔ جن کا قطر ۱۰ فٹ اور اونچائی ۳۰ فٹ ہے جو اس زمانے کے لحاظ سے غیر معمولی ہے۔ اسی نسبت سے قرآن پاک نے قوم عاد کی بستی کو کھمبوں والے ارم کا نام دیا ہے اور اس تہذیب کے بارے میں کہا ہے ''اس جیسی دوسری آبادیوں میں کوئی بھی پیدا نہیں کی گئی'' یہ بات یہاں پائے جانے والے برتنوں اور دوسری چیزوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہاں پر قدیم ترین آثار پانچ ہزار سال قبل مسیح کے بتائے جاتے ہیں، جو برتن یہاں سے برآمد ہوئے ہیں ان میں سے کچھ چار ہزار سال قبل مسیح کے میسوپوٹامیہ کے برتنوں جیسے ہیں۔ کچھ برتن ایک ہزار قبل مسیح کے برتنوں کے مشابہ ہیں۔ عربی، مصری، رومی اور یونانی ساخت کی چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عبار کی تہذیب اچھی خاصی تہذیب یافتہ تھی اور اس کا دور دراز سے رابطہ قائم تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ نے تازہ تحقیق کے بعد رپورٹ دی ہے ''یہ ایک بہت بڑا کارواں سرا تھا۔ جس میں کم از کم دو ہزار اونٹ اور پانچ سو افراد ہمیشہ موجود رہتے تھے قدیم زمانے کی انسانی آبادی کے مطابق یہ بات بلاشبہ کہی جاسکتی ہے۔ قوم عاد کا یہ شہر انسانی تہذیب کا ایک بڑا مرکز تھا بہر کیف حضرت ہودؑ کے سمجھانے اور ڈرانے سے بھی وہ لوگ معاصی سے باز نہ آئے تو اللہ کے عذاب نے ان کو آگھیرا اور ان کی شاداب زمینوں کا پانی نیچے گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ اور ہلاکت و تباہی ان کا مقدر بن گئی۔ دراصل اس قوم کی تباہی تو اسی وقت آ گئی تھی جب ان کے چشموں کا پانی زیر زمین اتر گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ساری تباہی تو قوم عاد کے اشرار اور مشرکوں کی تھی۔ چنانچہ فطری بات ہے کہ حضرت ہودؑ اور ان کے مبلغین اللہ کے عذاب سے بچا لیے گئے تھے یہی وجہ ہے کہ اس علاقہ میں دوسری صدی تک انسانی آبادی کے آثار پائے جاتے ہیں۔[1]

---

[1] ماخوذ از مضمون سہ روزہ دعوت دہلی، ۲۸؍ مارچ ۱۹۹۲ء

گنگوہ کے مصنّفین

شہروں سے دوردراز چاروں طرف دیہات سے گھرا ہوا یہ قصبہ گنگوہ ہے جس میں کوئی تاریخی اور صنعتی خوبی نہیں۔ جس کی وجہ سے یہ دنیا جہاں میں مشہور ہوتا۔ مگر سارے عالم میں نہ صرف اس کا تعارف ہے۔ بلکہ جو حضرات اس خاک سے اٹھے ہیں وہ اپنی خوبیوں اور خصوصیتوں یعنی علمی، دینی، روحانی،، اصلاحی، سماجی، سیاسی، ملی، تبلیغی، ثقافتی، تہذیبی، تدریسی، طبی، انتظامی، تالیفی، تاریخی، ادبی و شعری، ملکی، وطنی اور باہمی مساوات کی وجہ سے ہر شعبۂ حیات میں اپنی معتبر پہچان بنائے ہوئے ہیں۔ کہیں بھی کسی بھی شعبہ حیات کو لے لیجیے۔ یہاں کی شخصیات کی وہاں گہری چھاپ ثبت ملے گی۔ یہاں اول درجہ کے شیخ و پیر، نیک دل صوفی و سنت، جید عالم، مشہور محدث، ماہر ڈاکٹر، حاذق حکیم، ادیب، شاعر، وزیر، وکیل، جج، انجینئر، اور سیر، نقشہ نویس، ماہر تعمیرات، ماہر اقتصادیات، فقیہہ، مفتی، قاضی، ولی، درویش، ایک سے ایک بڑھ کر مدبر و مفکر اور دانشور ہوئے ہیں۔ اول سے آج تک معلوم مصنفوں کی فہرست حاضر ہے۔ کس نے کس علم پر کون سی کتاب تحریر کی کس نے کتنی کتابیں لکھیں۔ کس سن میں لکھی، جہاں تک معلوم ہوسکا لکھ دیا گیا ہے۔ حالانکہ بہت سوں کی پوری کتب کی تعداد نہ معلوم ہوسکی۔ بلکہ فی الحال تو گنگوہ کے اہل قلم و اہل علم حضرات کے نام بھی دستیاب نہیں ہوسکے۔ موجودہ اور آنے والی نسلیں اُن کے تعارف سے بھی محروم ہیں۔ اس زمانے کے قابل، اہل علم نے نہ جانے کیوں کوئی علمی تذکرہ نہیں لکھا۔ جس سے اس زمانے کی سرگرمیاں اور اُن لوگوں کے بارہ میں تفصیل معلوم ہوتی۔ اہل علم و بصیرت خاندانوں کے صاحبِ بصیرت حضرات میں سے آج تلاشِ بسیار کے بعد ہی شاید کوئی مل پائے — اور ہوسکتا ہے جو معلومات مجھے درکار ہیں، وہ نہ بتا پائے۔ بہر کیف جو حاصل ہوسکا ہے حاضر ہے اگر عنقریب یا بعد میں کچھ اور معلومات حاصل ہوسکیں تو انشاء اللہ ان کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی۔ قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا نام گرامی ان مصنّفین کی فہرست میں برکت کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔ ورنہ سبھی

جانتے ہیں کہ حضرت شیخ نے گنگوہ تشریف لا کر کوئی کتاب یہاں پر نہیں لکھی۔ بلکہ غالباً تمام تصانیف ردولی اور شاہ آباد کی تحریر کردہ ہیں۔

(۱) حضرت شیخ عبدالقدوس نعمانیؒ

انوارالعیون، اسرارالاخیار، رسالہ قدسیہ، ارشاد نامہ بحرالانشعاب شرح مصباح، شرح لمحات، حاشیہ فصوص الحکم، معارف شرح عوارف، مظہر العجائب فوائد القرأت، مکتوبات قدوسیہ، تعلیقات علیٰ شرح الصحائف فی الکلام۔

(۲) حضرت مولانا شیخ رکن الدین قدوسیؒ

لطائف قدوسی، مرج البحرین

(۳) حضرت مولانا شیخ حمیدالدین قدوسیؒ

اثبات وحدۃ الوجود

(۴) حضرت شیخ احمد قدوسیؒ

مجمع السرائر، حرمت سماع

(۵) حضرت مولانا مولوی مفتی قاضی القضات شیخ عبدالنبی قدوسیؒ

شرح اسماء الحسنیٰ، وظائف النبی، سنن المصطفیٰ، ردِ حرمت سماع، ردِ تنقیدات مروزی

(۶) حضرت شیخ داود جیؒ قدوسی

حدائق داؤدی (فارسی قلمی[1])

(۷) حضرت مولانا مولوی حافظ شیخ احمد چشتی نظامی نقشبندی، قادری نعیمیؒ (1670ء)

منتخب السلوک، اسرارالعارفین، انوارالعاشقین

(۸) قطب زماں حضرت مولانا مولوی حافظ حکیم شیخ رشید احمدؒ (1882ء)

فتاویٰ رشیدیہ، ثبات التراویح، زبدۃ المناسک، سبیل الرشاد، ہدیۃ الشیعۃ، لطائف رشیدیہ، فیصلہ اعلام، ہدیۃ المبتدی، القطوف الدانیۃ، ردالطغیان، اوثق الوریٰ وغیرہ

---

[1] یہ کتاب محترم بھائی جاوید احمد مرحوم برادر کلاں بھائی شارق جواد نبارہ مخدومی محمد یحییٰ سکریٹری کے پاس تھی۔ اُن کی وفات سے کچھ قبل میں نے اس کتاب کی زیارت کی تھی (نسیم ایوبی)

(۹) حضرت مولانا محمد عبداللہؒ
تیسیر المبتدی، تیسیر المنطق

(۱۰) حضرت مولانا مولوی مفتی ضیاء احمد قدوسیؒ
رفع الخلاف عن حکم مونوغراف (گراموفون) التجر فی الصوم، تخریج احادیث حیاۃ المسلمین۔

(۱۱) حضرت مولانا شیخ محمد حسن قدوسیؒ
گلزار صابری (قلمی)

(۱۲) حضرت مولانا مولوی حافظ شیخ حکیم محمد اسماعیل قدوسیؒ
''جواب، اشتہار غیر مقلدین'' (دس سوالوں کے جوابات)

(۱۳) حضرت مولانا مولوی حافظ مفتی شیخ محمود الحسنؒ محمود
(قریباً ۲۱ کتب) فتاویٰ محمودیہ ۱۸ جلدیں، مواعظ فقیہہ الامت، وصف شیخ، وصف محبوب، حدود اختلاف، شوریٰ و اہتمام، شاہد قدرت، مسلک علماء دیوبند، اسباب مصائب اور اس کا علاج، سودی قرضے، خلاصۂ تصوف، نعت محمود۔

(۱۴) حضرت مولانا مولوی حکیم شیخ عبدالرشید محمود رشیدی عرف حکیم ننو میاں
سیرتِ قدوسیہ، اشعارِ محمود، الکتاب المحمود، مکتوبِ حقیقت، مکتوباتِ ثلاثہ، اجتماعِ گنگوہ، جامع المجددین

(۱۵) حضرت مولانا حکیم محمد یعقوب قدوسی
مجموعہ نظمیات، مسدس بہار علم

(۱۶) حضرت مولانا حکیم شیخ محمد یوسفؒ قدوسی
اعمالِ یوسفی

(۱۷) حضرت مولانا شیخ محمد عادلؒ قدوسی
رسالت خاتم النبیین، قضاوقدر، سیرت صدیقِ اکبر

(۱۸) حضرت مولانا حافظ محمد یوسفؒ ایوبی
شجرۂ طیبہ حسینیہ، ضروریاتِ اسلام، اعجاز یوسفی

(۱۹) حضرت مولانا شیخ قریش احمد قدوسیؒ

کلید معرفت

(۲۰) حضرت الحاج مصطفٰی کامل رشیدیؒ

شیطان شیخ الموا حدین، ملفوظات

(۲۱) حضرت مولانا مولوی اعجاز الحق اعجاز قدوسی

رسول پاک کی صاحبزادیاں، رسول اللہ کے دو محبوب، حضرت علیؓ، سیرت بتول، تذکرہ صوفیائے سندھ، تذکرہ صوفیائے پنجاب، ہمارے نبی کے صحابہ، سیرت حضرت عائشہ، حضرت عثمان غنی، شیخ عبدالقدوس اور ان کی تعلیمات، تذکرہ صوفیائے بنگال، سراپائے رسولؐ، تاریخ سندھ، حضرت امام حسینؓ، عہد رسالت کے دو بچے، مسلمان بیبیاں، درسگاہِ رسول کے دو طالب علم، سندھ کی تاریخی کہانیاں، تذکرہ صوفیائے سرحد، سیرت امام حسنؓ (قریباً ۲۰ کتب)

(۲۲) حضرت مولانا مولوی حافظ محمد حنیف

احوال المصنفین، الصبح النوری، تحفۃ الادب، شرح ہدایہ، المروض النفیر، قدسی تنویرات، وہبی تحقیقات، نیل الامانی ۲ جلدیں، معدن الحقائق ۲ جلدیں، قال ابوداؤد ۲ جلدیں۔

(۲۳) حضرت قاضی منصور احمد حسرت

مشائخ عظام ضلع سہارن پور

(۲۴) جناب عمران عظیم قریشی ایڈووکیٹ

حرفِ راز، کمند حرف، رنگ صدا

(۲۵) حضرت مولانا حافظ محمد انور

انوار الدرایات، الحلل المرضیٰ

(۲۶) حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ

گنگوہ کی روحانی شخصیات، فضیلت تقویٰ

(۲۷) حضرت مولانا حکیم عبدالوہاب نابینا دہلوی ثم گنگوہی ـــ رسالہ نبض

گنگوہ کے مشائخِ عظام

راجہ گنگ سے معرکہ آرا، حضرات کوئی معمولی لشکری اور سپاہی نہ تھے بلکہ خاندان حضرت ابوایوب انصاری کے وہ روحانی چاند سورج تھے جنھوں نے دنیائے انسانیت کو اپنی روحانیت کے نور سے منور کر دیا ہے۔ ان میں علماءِ وقت، مفتی وفقیہ، روشن ضمیر شیوخ، نادر الوجود اولیاء اور تصوف کے امام و پیشوا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مبارک نفوس کے قدموں کے نشانات گنگوہ کے درو بام پر ثبت ہیں اور انھیں نورانی انفاس کا صدقہ ہے کہ اس زمین سے ہر دور میں علم و فضل کا فیض، عام رہا ہے۔ شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کے یہاں دریا بہتے رہے ہیں۔ اور بہہ رہے ہیں۔ دنیا، جہان ان سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ہر فرد یہاں کا اپنے آپ میں سمندر سے کم نہیں تھا۔ نہ معلوم کتنے نفس، کتنے دل، کتنے دماغ یہاں سے پاکیزگی، آگہی اور بصیرت کی تابندگی سے منور ہو کر نکلتے ہیں۔ اور تادم تحریر یہ قدیمی سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اور قیامت تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ کیونکہ بعض بعض شیوخ کے مریدین ہزاروں کی تعداد سے متجاوز ہے اور کئی حضرات کے مریدین وخلفا لاکھوں سے بھی زیادہ ہیں۔ حضرت شیخ ابوسعید قدوسیؒ کے خلفاء میں سے سلسلہ دیدار شاہیہ اس کی زندہ مثال ہے۔ اور جس قدر علماءِ دیوبند، سہارنپور، لکھنؤ، بریلی وغیرہ سب اسی سلسلہ ابوسعید قدوسیؒ سے ہیں جو تمام عالم میں پھیلے ہوئے ہیں— اور یہ بات گنگوہ کے عجائب حالات میں سے ہے کہ قطب العالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ چاروں سلسلے چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور سلسلہ قادریہ کے امام و شیخ تھے بلکہ ان چاروں سلسلوں کی دستار فضیلت کے آپ تنہا مالک تھے۔ چاروں سلسلوں کی مسند پر متمکن ایسی عہد آفریں شخصیت شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ گنگوہ کے اہل سلوک و تصوف اور مشائخ عظام کی فہرست جس قدر مجھے معلوم ہے درج ذیل ہے:

(۱) حضرت مولانا خواجہ شیخ امام ابومحمد آخونؒ شہید ایوبی

حضرت مولانا خواجہ شیخ وصی الدین عرف پیر کلکلیؒ شہید ایوبی

(۲) حضرت مولانا خواجہ شیخ عبداللہ نیکمرد غازیؒ شہید ایوبی

(۳) حضرت مولانا خواجہ شیخ حسین الدینؒ ایوبی

(۴) حضرت مولانا خواجہ شیخ محمد غوریؒ شہید چشتی ایوبی

(۵) حضرت مولانا خواجہ بابا شیخ تاج الدینؒ شہید ایوبی

(۶) حضرت مولانا خواجہ شیخ امیر الدین عرف راجنؒ ایوبی

(۷) حضرت مولانا خواجہ شیخ شرف الدین عرف ملکؒ ایوبی

(۸) حضرت مولانا خواجہ شیخ محمد محسن عرف بکھنؒ ایوبی

(۹) حضرت مولانا خواجہ شیخ امین الدین عرف اَمّنؒ ایوبی

(۱۰) حضرت مولانا خواجہ شیخ بصیر الدینؒ شاہ ولایت شہید ایوبی

(۱۱) حضرت مولانا مفتی امین الدین شہید ایوبی

(۱۲) قطب عالم حضرت مولانا حافظ شیخ عبدالقدوسؒ نعمانی

(۱۳) حضرت مولانا خواجہ شیخ حمید الدین قدوسیؒ

(۱۴) حضرت مولانا خواجہ شیخ احمد قدوسیؒ

(۱۵) حضرت مولانا خواجہ شیخ علیؒ قدوسی

(۱۶) حضرت مولانا خواجہ شیخ محمد محدثؒ قدوسی

(۱۷) حضرت مولانا خواجہ شیخ عبدالسلامؒ قدوسی

(۱۸) حضرت مولانا خواجہ شیخ رکن الدینؒ قدوسی

(۱۹) حضرت مولانا خواجہ شیخ عزیز اللہؒ قدوسی

(۲۰) حضرت مولانا خواجہ شیخ عبدالصمدؒ قدوسی

(۲۱) حضرت مولانا خواجہ شیخ فتح اللہؒ قدوسی

(۲۲) حضرت مولانا خواجہ شیخ عبدالکبیر بالا پیرؒ قدوسی

(۲۳) حضرت مولانا مولوی حافظ قاضی مفتی شیخ عبدالنبیؒ قدوسی

(۲۴)

(۲۵) حضرت شیخ طاہر محمد قدوسی

(۲۶) حضرت مولانا خواجہ شیخ ابوسعید ''دست رسول'' قدوسی

(۲۷) حضرت مولانا خواجہ شیخ محمد صادق ''محبوب الٰہی'' قدوسی

(۲۸) حضرت مولانا خواجہ شیخ محمد داؤد جیؒ قدوسی

(۲۹) حضرت مولانا خواجہ شیخ محمد جیؒ قدوسی

(۳۰) حضرت شیخ ماموں اللہ بخش صادقی [۱]

(۳۱) حضرت الحاج محمد قاسم قادری، نقشبندی

(۳۲) حضرت مولانا حسام الدین عرف شیخ اوجھڑ بغدادیؒ

(۳۳) حضرت شیخ رحمۃ اللہ چشتیؒ

(۳۴) حضرت شیخ شرف الدینؒ ایوبی

(۳۵) حضرت مولانا مولوی مفتی ضیاء احمدؒ ایوبی

(۳۶) حضرت مولانا حافظ خواجہ عبداللہؒ چشتی، نظامی

(۳۷) حضرت مولانا حافظ احمدؒ چشتی، نظامی، قادری، نقش بندی

(۳۸) حضرت شیخ عبدالکریم خاںؒ چشتی متوطن تیتروں

(۳۹) حضرت مولانا شیخ غلام فرید چشتی، نظامی، نقشبندی

(۴۰) حضرت مولانا خواجہ شیخ محبوبؒ چشتی، قادری، نقشبندی

(۴۱) حضرت شیخ پیر جی سید نصیر الدین چشتی، نظامیؒ

(۴۲) حضرت مولانا قاری خواجہ شیخ محمد یحییٰؒ چشتی نظامی

(۴۳) حضرت مولانا سید شیخ علیم اللہ عرف ''پیر ہوں، ہاں''، نقش بندی

(۴۴) قطب زماں حضرت مولانا حافظ حکیم الحاج رشید احمدؒ محدث گنگوہی

(۴۵) حضرت مولانا فخر الدین ایوبی عرف ''بڑے مولوی صاحب''

---

[۱] حضرت شیخ ماموں اللہ بخش جنات میں سے تھے آپ حضرت شیخ محمد صادقؒ کے خلیفہ تھے۔ انوار العاشقین از حضرت مولانا مشتاق احمد انبہٹوی۔

(۴۶) حضرت مولانا مولوی حافظ مفتی محمود الحسنؒ ایوبی

(۴۷) حضرت شاہ درویش احمدؒ قدوسی

(۴۸) حضرت شاہ حکیم قمیش احمد کیف قدوسیؒ

(۴۹) حضرت شاہ حکیم قریش احمد قریشؔ قدوسیؒ

(۵۰) حضرت شاہ ممتاز جہاںؒ ممتاز قدوسی

(۵۱) حضرت شاہ محمد حیاتؒ قدوسی

(۵۲) حضرت شاہ محمد رحمۃ اللہ قدوسی

(۵۳) حضرت شاہ محمد عبداللہ قدوسی

(۵۴) حضرت شاہ محمد حسنؒ قدوسی

(۵۵) حضرت شاہ عبدالاحدؒ قدوسی

(۵۶) حضرت شاہ محمد صالحؒ قدوسی

(۵۷) حضرت شاہ محمد صلاحؒ قدوسی

(۵۸) حضرت شاہ غلام بوعلیؒ قدوسی

(۵۹) حضرت شاہ قطب الدین علیؒ قدوسی

(۶۰) حضرت سلطان جہاںؒ قدوسی

(۶۱) حضرت محمد عمرؒ قدوسی

(۶۲) حضرت مولانا شاہ اعجاز جہاںؒ اعجاز قدوسی

(۶۳) حضرت مولانا شاہ امتیاز جہاںؒ قدوسی

(۶۴) حضرت مولانا مفتی حکیم عبدالرشید محمود رشیدیؒ ایوبی

(۶۵) حضرت شاہ عنایت احمدؒ قدوسی

(۶۶) حضرت مولانا شاہ محمد میاںؒ قدوسی

(۶۷) حضرت مولانا حافظ حامد حسنؒ ایوبی

(۶۸) حضرت شاہ لطیف احمدؒ قدوسی

(۶۹) حضرت شاہ شفیق احمدؒ قدوسی

(۷۰) حضرت سید راجہؒ چشتی

(۷۱) حضرت شاہ عطا حسینؒ قدوسی

(۷۲) حضرت شاہ محمد حسینؒ قدوسی

(۷۳) حضرت شاہ صوفی بشیر احمدؒ قدوسی

(۷۴) حضرت شاہ الطاف الرحمٰنؒ قدوسی

(۷۵) حضرت شاہ منظور احمدؒ قدوسی

(۷۶) حضرت مولانا حافظ محمد یعقوبؒ ایوبی

(۷۷) حضرت مولانا حافظ محمد یوسفؒ ایوبی

(۷۸) حضرت مولانا شاہ منظور احمدؒ قدوسی

(۷۹) حضرت الحاج کامل مصطفٰی رشیدیؒ ایوبی

(۸۰) حضرت مولانا حکیم شاہ مسعود احمد قدوسی

(۸۱) حضرت صوفی ظریف احمد عرف مُنّا ایوبی

(۸۲) حضرت شاہ حکیم ظفر احمد قدوسی

(۸۳) حضرت شاہ سجاد جہاںؒ قدوسی

(۸۴) حضرت شاہ حکیم محمود احمد قدوسی اجمیری

(۸۵) حضرت شاہ محی الدین علیؒ قدوسی

(۸۶) حضرت مولانا مفتی محمد سلمان منصوری

(۸۷) حضرت شیخ محمد شبلی رشیدی

(۸۸) حضرت شاہ مہتاب جہاں قدوسی

درگاہِ کلیر شریف کے گنگوہی سجادہ نشین

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ کلیر کے عوام کی زندگی بے علمی، غربت اور امیروں، رئیسوں کی متکبرانہ وظالمانہ روش کی قید تھی۔ چنانچہ ان امیروں کو حضرت شیخ علاء دالدین علی

احمد صابر کی یہاں سکونت و آمد بہت کھلی اور انھوں نے حضرت کو بیحد تنگ کیا اور مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا حضرت کے صبر و تحمل ہی کا نتیجہ تھا کہ پہلے یہاں زبردست زلزلہ اور آندھی آئی پھر طاعون کی وبا پھیلی۔ اس کے بعد بڑی ہولناک آگ لگی۔ جس سے تمام شہر جل کر راکھ ہو گیا۔ جو لوگ یہاں باقی رہ گئے تھے وہ بھی ادھر اُدھر بھاگ گئے حضرت صابرؒ، اس اونچی نیچی زمین کے ایک اونچے ٹیلہ پر مقیم ہو گئے اور خلوت میں اطمینان قلب کے ساتھ دیدار الٰہی کا شوق استغراق اس قدر بڑھا کہ بارہ سال تک گولر کی شاخ پکڑے کھڑے رہے۔ اس عرصہ میں یہاں گھنا جنگل تیار ہو گیا۔ حضرت شمس الدین ترک پانی پتی کے آنے سے یہاں چند حضرات کی آمد و رفت ہوئی تو ضرور مگر حضرت صابر کی وفات کے بعد پھر یہاں وہی پہلا سا ہو کا عالم ہو گیا۔ کیونکہ حضرت شمس وفات صابرؒ کے تین دن کے قیام کے بعد کبھی کلیر شریف آئے ہی نہیں۔ لہٰذا لوگ مزار حضرت صابر کو بالکل بھول گئے کہ مزار کہاں تھا۔ ویسے بھی یہاں سے بارہ بارہ کوس تک کہیں آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ حضرت صابر کا انتقال ۱۲۹۶ء میں ہوا تھا۔ اور غالباً ۱۵۲۲ء میں حضرت قطب عالم نے مزار کا پتہ لگایا تھا اور آپ کی درخواست پر ہی حضرت صابرؒ عالم جلال سے جلوۂ جمال میں قیام پذیر ہوئے اور سب کو مزار پر حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی۔ حضرت قطب عالم سلسلۂ صابری کے مجدد کہلائے۔ روضہ اور مسجد کی تعمیر آپ کے ہی ذریعہ ہوئی۔ اور آپ ہی یہاں کے سب سے پہلے سجادہ نشین ہوئے اور آج تک آپ کی اولاد وہاں کی سجادہ نشین ہوتی رہی ہے۔ حضرت قطب عالم ۱۵۲۲ء سے ۱۵۴۸ء تک سجادہ رہے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند شاہ عبدالحمید پھر آپ کے فرزند عبدالصمد پھر آپ کے فرزند شاہ شیخ فتح اللہ پھر آپ کے فرزند شاہ شیخ محمد صادق محبوب الٰہی پھر آپ کے فرزند شیخ شاہ محمد جیؒ پھر آپ کے فرزند کلیر شریف کے سجادہ نشین ہوئے یعنی آپ ۱۶۵۶ء تک سجادہ رہے۔

۱۸۵۵ء تک گنگوہ میں رہتے ہوئے قدوسی حضرات درگاہ کلیر کی سجادگی کرتے رہے۔ مگر ۱۸۵۵ء سے شاہ ظہور الحسن شہید نے کلیر شریف میں سکونت اختیار کی مگر ان حضرات کے مکانات آج تک گنگوہ شریف میں موجود ہیں اس لیے کہ یہ حضرات اصل باشندہ تو یہیں کے

ہیں۔ چنانچہ ناانصافی ہوگی اگر ان روحانی چاند ستاروں کے نام یہاں درج نہ کیے جائیں۔ جن حضرات کے نام ابھی تک تحریر نہیں ہو سکے ہیں یہاں لکھے جاتے ہیں۔

(۸۸) حضرت شاہ احمدؒ صابری عرف شاہ بڑے عرف شاہ باولے ابن حضرت شیخ محمد جیؒ

(۸۹) حضرت شاہ علی رضا صابریؒ

(۹۰) حضرت شاہ احسان علیؒ صابری

(۹۱) حضرت شاہ علی بخشؒ صابری

(۹۲) حضرت شاہ نیاز علیؒ صابری

(۹۳) حضرت شاہ ابوالحسنؒ صابری

(۹۴) حضرت شاہ ظہور الحسنؒ شہید صابری

(۹۵) حضرت شاہ عبدالرحیمؒ صابری

(۹۶) حضرت شاہ نواب احمدؒ صابری

(۹۷) حضرت شاہ اعجاز احمدؒ صابری

(۹۸) حضرت شاہ منصور میاں صابری

(۹۹) حضرت مولانا محمد اسماعیلؒ ذبیح بوڑیہ وی چشتی قدوسی

(۱۰۰) پیر جی رشید احمد کیرانوی قادری

(۱۰۱) حکیم مولانا شاہ محمد سعد رشید اجمیری

(۱۰۲) مولانا وسیم احمد سنسار پوری

(۱۰۳) شاہ قلندر بخش قدوسی

(۱۰۴) حاجی بدرالدین قدوسی

(۱۰۵) شاہ فخر الدین قدوسی

(۱۰۶) شاہ نور احمد

(۱۰۷) ملا محمد حسن

(۱۰۸) مولانا محمد یوسف منصوری
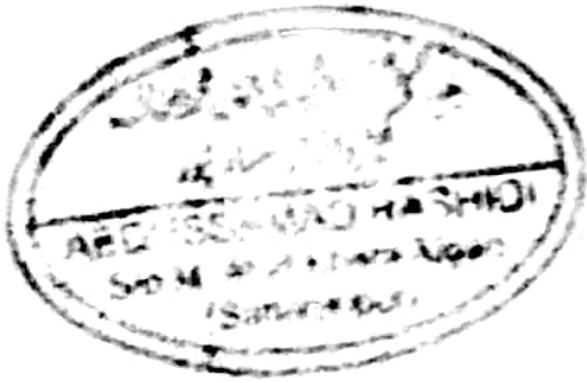
علمائے گنگوہ شریف

علم ایسی انمول دولت ہے جو انسان کے اندر معرفتِ خداوندی اور حق شناسی کا وہ جوہر پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے انسان باوقار اور مہذب زندگی بسر کرتا ہے اور ملک کا بہترین شہری اور معاشرہ کا نیک خصلت فرد قرار پاتا ہے — اولیاء اللہ کے وجود نے جہاں گنگوہ کے عوام وخواص کو تزکیۂ باطن، ریاضت ومجاہدہ، تطہیر باطن کا معقول اور معتبر مخرج ومنبع بنادیا تھا۔ وہیں عالموں نے بندگان خدا میں تہذیب اخلاق، فضائل ومحامد کا شوق، اکتساب علم وکمال کا ولولہ تعلیماتِ حقانیہ پر عمل پیرا رہنے اور امر ونواہی کے موافق عملی جذبہ بیدار کیا احکامِ خدا اور رسول واتباع شریعت کی ترقی وترویج کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ رشد وہدایت کو ہمہ دم پیش نظر رکھا۔ اپنے مواعظ حسنہ سے مردہ دلوں کو صالح اور صحتمند اسلام کا حیات بخش پیغام دیا۔ یہ وہ بوریہ نشین شہنشاہ ہیں جن کی زندگی، درویشانہ وفقیرانہ تھی۔ درس وتدریس حدیث پاک، ارشاد وتلقین محبوب مشغلہ تھا۔ یہی وہ صاحب علم ومعرفت اشخاص تھے جن کے دروازوں پر شاہِ وقت آکر اپنا سر جھکاتے تھے۔ انھیں پاک طینت علماء کا صدقہ ہے کہ اطرافِ گنگوہ میں بلالحاظ مذہب وملت ایک باہمی، برادرانہ بااخلاق مخلصانہ مہذب فضا قائم ہے۔ دوسری بہت سی بستیوں کے مقابلے شرافت ہے، تہذیب ہے، تمیز ہے، احترام ہے۔ ادب وآداب ہے، شرم وحیا، تعلیمی فضا ہے، علما کی صحبتوں کا ثمرہ ہے کہ رہن وسہن، لباس میں نفاست ہے مگر سادہ روی ہے۔ گفتگو میں اعتدال ہے سلامتی ہے۔ مساوات ہے آپسی پیار ہے۔ بے تعصبی ہے، گھٹن نہیں ہے۔ دِلوں میں صدق وصفا ہے۔ تقویٰ وطہارت ہے۔ غیرت وخودداری ہے۔ مگر تواضع وانکساری ہے دل، حق وانصاف پر آمادہ ہیں۔

علماءِ گنگوہ کی فہرست میں جس قدر نام فراہم ہوسکے ہیں۔ حاضر ہیں:

محلہ مخدوم جہاں

۱ قطب عالم حضرت مولانا حافظ شیخ عبدالقدوس نعمانی ۲ مولانا حمید الدین قدوسی

۳ مولانا رکن الدین قدوسی

۴ مولانا حسام الدین عرف اوجھڑ

۵ مولانا عبدالنبی قدوسی

۶ مولانا ہدایت احمد ایوبی

۷ قطب زماں حضرت مولانا رشید احمد ایوبی

۸ مولانا حکیم مسعود احمد ایوبی

۹ مولانا محمد تقی ایوبی

۱۰ مولانا محمد ابونصر ایوبی

۱۱ مولانا مفتی ضیا احمد قدوسی

۱۲ مولانا حکیم عبدالرشید محمود رشیدی ایوبی

۱۳ مولانا اعجاز جہاں قدوسی

۱۴ مولانا محمد اسماعیل ذبیح چشتی

۱۵ مولانا محمد میاں قدوسی

۱۶ مولانا منظور احمد قدوسی

۱۷ مولانا فخرالحسن قدوسی

۱۸ مولانا داؤد قدوسی

۱۹ مولانا ذکریا قدوسی

۲۰ مولانا شریف حسین قدوسی

۲۱ مولانا اعجازالحق قدوسی

۲۲ مولوی ارشد مسعود رشیدی ایوبی

۲۳ مولوی راشد مسعود رشیدی ایوبی

۲۴ مولوی احمد میاں قدوسی

۲۵ مولوی محمد ناصر جمیل قدوسی

۲۶ مولانا شاہ امتیاز جہاں قدوسی

۲۷ مولانا حکیم شفیق احمد قدوسی

۲۸ مولانا محمد احمد رشیدی ایوبی

۲۹ مولانا سعید احمد رشیدی ایوبی

۳۰ مولوی انیس احمد ندوی

محلہ مبارک علی

۱ مولانا حکیم محمد اسماعیل قدوسی

۲ مولانا حکیم محمد یعقوب قدوسی

۳ مولانا حکیم محمد یوسف قدوسی

۴ مولانا محمد عادل قدوسی

۵ مولانا حکیم مسعود احمد قدوسی اجمیری

۶ مولانا حکیم اسعد احمد قدوسی اجمیری

۷ مولانا حکیم محمد ساعد قدوسی اجمیری

۸ مولانا حکیم سعود احمد قدوسی اجمیری

۹ مولانا حکیم محمد سعد رشید

۱۰ مولانا قاری شریف احمد

۱۱ مولانا شمس الدین

۱۲ مولانا مفتی خالد سیف اللہ

۱۳ مولانا قاری عبیدالرحمٰن

۱۴ مولوی سفیان الحق

۱۵ مولوی معین الدین

۱۶ مولوی نجم الدین

۱۷ مولوی محمد عارف

محلہ اشرف علی

۱ مولانا محمد اسماعیل
۲ مولانا سعید احمد
۳ مولانا احمد جان
۴ مولانا مفتی محمد شاہ
۵ مولانا محمد اسحٰق
۶ مولانا مسعود احمد
۷ مولانا عبدالسلام
۸ مولانا عبدالقیوم
۹ مولانا محبوب حسن
۱۰ مولانا عبدالرحمٰن
۱۱ مولانا صدیق احمد
۱۲ مولانا محمود احمد
۱۳ مولانا محمد ابراہیم

محلہ غلام اولیاء

۱ مولانا حافظ شیخ احمد چشتی نعیمی
۲ مولانا محمد یحییٰ چشتی نعیمی
۳ مولانا عبدالرسول نقشبندی
۴ مولوی علیم اللہ نقشبندی
۵ مولانا عبداللہ چشتی
۶ مولانا غلام فرید چشتی
۷ مولانا مفتی محمد حنیف
۸ مولانا نواب احمد ندوی

محلہ بہاؤالدین

۱ مولانا فخرالدین ایوبی عرف بڑے مولوی صاحب
۲ مولانا حکیم فخرالدین ایوبی
۳ مولانا محمد عبداللہ ایوبی
۴ مولانا محمد اصغر
۵ مولانا محمد انور
۶ مولانا محمد سرور
۷ مولانا مفتی سلمان احمد
۸ مولانا محمد یوسف
۹ مولانا سیّد حکیم خوشنود ربانی
۱۰ مولانا مفتی سیّد خوش جمال
۱۱ مولانا ابومحمد ایوبی
۱۲ مولانا محمد ہاشم ایوبی
۱۳ مولانا سعیدالدین ایوبی
۱۴ مولوی محمد یونس
۱۵ مولوی لبنان احمد
۱۶ مولوی مفتی سبحان احمد
۱۷ مولوی ثوبان احمد

محلہ غلام صابر

۱ مولانا حسین الدین ایوبی
۲ مولانا امین الدین عرف امن ایوبی
۳ مولانا محمد محسن عرف بکھن ایوبی
۴ مولانا امیر الدین عرف راجن ایوبی

۵ مولانا اشرف الدین عرف ملک ایوبی

۶ مولانا مفتی امین الدین ایوبی

۷ مولانا محمد یعقوب ایوبی

۸ مولانا محمد اسماعیل ایوبی

۹ مولانا محمد یوسف ایوبی

۱۰ مولانا حامد حسن ایوبی

۱۱ مولانا حافظ مفتی محمود الحسن ایوبی

۱۲ مولانا محمد ایوب ایوبی

۱۳ مولانا محمد خالد سیف اللہ ایوبی

۱۴ مولانا ڈاکٹر محمد موسیٰ ایوبی

۱۵ مولانا حسن عسکری[1] ایوبی

۱۶ مولانا فدا حسین فدا ایوبی

۱۷ مولانا عبدالرزاق ایوبی

۱۸ مولانا محمد ارمان ایوبی

۱۹ مولانا عبدالرحیم ایوبی

۲۰ مولانا ڈپٹی محمد ابراہیم ایوبی

۲۱ مولانا جلیل احمد ایوبی

۲۲ مولانا عبدالواسع ایوبی

۲۳ مولوی سید محمد اعظم ایوبی

محلہ قریشیان

۱ مولانا مفتی ولی محمد قریشی

۲ مولانا دلشاد احمد ثاقب قریشی

۳ مولوی افضال احمد قریشی

۴ مولوی اقبال احمد قریشی

۵ مولوی اکرام احمد قریشی

محلہ ثانکان

۱ مولانا شفیق احمد صدیقی

۲ مولانا عتیق احمد صدیقی

محلہ محمد غوری.

۱ حضرت مولانا امام ابو محمد آخونؒ ہراتی

۲ حضرت مولانا شاہ محمد غوریؒ ہراتی

۳ مولانا وسیم احمد سنسارپوری
شیخ الحدیث مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ

۴ مولوی مفتی کلیم احمد

۵ مولوی قسیم احمد

۶ مولوی رئیس احمد

■■

---

[1] مضمون ''جو شہید ہوئے ہیں ان کی ذرا یاد کرو قربانی'' سید ماجد حسن مظاہری، نیو ایرا، اکیڈمی واؤد سرائے سہارنپور، راشٹریہ سہارا ویکلی مورخہ ۲۵؍جنوری ۲۰۰۴ء۔ مولانا حسن عسکری کو ۱۸۵۷ء میں پھانسی دی گئی۔

گنگوہ کے حکیم و ڈاکٹر

گنگوہ شریف جہاں روحانیت کا مرکز و مدرسہ رہا ہے جس میں دل و دماغ روح ونظر اور جسم کی ظاہری و باطنی پاکیزگی و تازگی، بالیدگی اور صفائی کا خصوصی روحانی انتظام والتزام رہا ہے۔ وہیں یہاں جسمانی امراض کا علاج بھی اولین دور سے ہوتا آرہا ہے۔ پُرانے زمانے سے ہی ہر طبقہ کے لوگ طب وحکمت کو اشرف و اعلیٰ پیشوں میں شمار کرتے آئے ہیں۔ کیونکہ اس پیشہ سے وابستہ انسان حرص وہوس سے بے نیاز ہوکر مریض کی پریشانی میں غرق رہتا ہے اور اس کا حل طبی طور سے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسروں کے دکھ ودرد میں سہارا بنتا ہے اور ان کو جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیشۂ طب اور اخلاقیات ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں اس بات کا خیال رکھا جا رہا ہے کہ حکیم و ڈاکٹر شریف النفس، نیک اور اخلاق میں اعلیٰ درجہ کا ہو۔ قدیم دور میں دیسی جڑی بوٹیوں سے ہی علاج ومعالجہ کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں دیسی طریقۂ علاج ہی سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ انگریزی طریقۂ علاج نہ ہونے کے برابر تھا۔ ڈاکٹر اس وقت خال خال ملتے تھے۔ لیکن آج کل بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ انگریزی طریقۂ علاج زیادہ ترقی پر ہے۔ مگر یونانی اور ویدک طریقوں کی اہمیت وافادیت آج بھی بدستور ہے۔ اگرچہ زمانۂ قدیم سے ہی حاذق و ماہر اور نامور حکیموں، ڈاکٹروں کا یہ قصبہ مشہور زمانہ مرکز رہا ہے۔ ملک اور بیرونِ ملک کے افراد یہاں کے کامیاب ماہرینِ امراض سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں اور فیض اٹھا رہے ہیں۔ دور، دراز کے شہروں اور ملکوں میں یہاں کے طبیبوں کی نہ صرف وہاں ضرورت وچاہت ہے بلکہ ان کا وہاں زبردست احترام بھی ہے کیونکہ یہ حضرات فنی طور پر کامل واکمل ہی نہیں۔ ماہرین امراض بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دست شفا بھی بخشا ہے — اپنی محدود جانکاری کی بنا پر گنگوہ کے مسیحاؤں کی ایک فہرست پیش خدمت ہے:

محلہ محمد غوری

حکیم عزیز احمد ایوبی
حکیم محمد انور ایوبی
ڈاکٹر منور نعیم ایوبی
ڈاکٹر علیم افسر ایوبی
ڈاکٹر ارشاد نعیم ایوبی
ڈاکٹر بشریٰ نسیم ایوبی
ڈاکٹر عظیم انور ایوبی
ڈاکٹر شہزاد نعیم ایوبی
ڈاکٹر مقیم انظر ایوبی
ڈاکٹر دلشاد نعیم ایوبی
ڈاکٹر غزالہ نعیم ایوبی
ڈاکٹر شمشاد نعیم ایوبی
ڈاکٹر رشدیٰ نسیم ایوبی
ڈاکٹر جیمل سینی
ڈاکٹر جلال الدین
ڈاکٹر اوم پرکاش پینچ وال
حکیم رام رتن لال

محلہ ٹانکان

حکیم سراج الدین
وید صندل سنگھ
ڈاکٹر شیام لال
ڈاکٹر ٹھاکر دت
ڈاکٹر سریندر کمار
ڈاکٹر مکیش کمار
حکیم افضال احمد
ڈاکٹر رضوان احمد
ڈاکٹر ششی کانت
ڈاکٹر انوپ کمار بھٹناگر
ڈاکٹر راجندر کمار
ڈاکٹر جوگندر کمار
ڈاکٹر راکیش کمار مندھوریا
مکیش کمار مندھوریا

محلہ ایشرا

ڈاکٹر رام کرشن مہتہ
ڈاکٹر سبودھ کمار

محلہ چھتہ

ڈاکٹر واسودیو
وید کاشی رام
وید اوگرسین
وید تاراچند
ڈاکٹر راج کمار ورما
ڈاکٹر آتمارام مندھوریا
ڈاکٹر بھگوت شرن
ڈاکٹر سبھاش چند
ڈاکٹر نریش چند سنگل
ڈاکٹر راج کمار
ڈاکٹر جتیندر پال کپور
ڈاکٹر پروین کمار شرما

محلہ قانون گویان

ڈاکٹر نرنجن لال
ڈاکٹر امرناتھ
ڈاکٹر دیوندر کمار
ڈاکٹر شیکھر کمار

محلہ مخدوم جہاں

حضرت مولانا حکیم رشید احمد
حکیم مولانا مسعود احمد
حکیم مولانا عبدالرشید محمود
حکیم مولانا شریف احمد قدوسی
حکیم مولانا شفیق احمد قدوسی
حکیم محمد یعقوب قدوسی
ڈاکٹر محمود رشید قدوسی
ڈاکٹر یوسف رشید قدوسی
ڈاکٹر عارف رشید قدوسی
ڈاکٹر مسعود رشید قدوسی
ڈاکٹر ادریس احمد
ڈاکٹر شمیم احمد
حکیم عطا حسین قدوسی
حکیم جمیل احمد قدوسی

ڈاکٹر سہیل احمد

محلّہ الٰہی بخش

حکیم قمیش احمد
حکیم قریش احمد
حکیم محمد صدیق
حکیم محمد ظفر
ڈاکٹر عاصم قدوسی
ڈاکٹر راج کمار
ڈاکٹر تیج پال
ڈاکٹر ہری چند
ڈاکٹر سریندر کمار
مہر سنگھ بینجوآل

محلّہ بہاؤالدین

ڈاکٹر اللہ بندہ
حکیم عبداللہ
حکیم محمد احمد
حکیم مطلوب احمد
حکیم محمد یٰسین
حکیم سوندھا
حکیم نظیر حسین
حکیم فیض الحسن
حکیم عبدالرحیم
حکیم عبدالوحید

محلّہ غلام صابر

حکیم عطا حسین
حکیم امیر احمد
حکیم علی احمد
حکیم مشتاق احمد
ڈاکٹر محمد اکرام
حکیم منگل سین شرما
حکیم خورشید احمد
ڈاکٹر محمد موسیٰ
حکیم خوشنود ربانی
حکیم خوش جمال
ڈاکٹر عدنان مسعود

محلّہ کوٹلہ

حکیم سیّد لیاقت حسین
حکیم افتخار حسین
حکیم احسان الحق
حکیم محمد یوسف
حکیم مرزا شہزاد احمد

محلّہ گوجران

ڈاکٹر رادھا کرشن
حکیم پیارے لال

محلّہ غلام اولیاء

ڈاکٹر بارومل

ڈاکٹر ارن کمار
ڈاکٹر رمیش کمار
ڈاکٹر راکیش کمار
ڈاکٹر مینا کماری
ڈاکٹر پرتیبھا کماری
ڈاکٹر محمد اکبر
ڈاکٹر محمد اختر

محلّہ قریشیان

ڈاکٹر مقبول قریشی
ڈاکٹر محمد ناظم قریشی
حکیم دلشاد احمد ثاقب قریشی

محلّہ بابورائے

ڈاکٹر رامیشور پرشاد
ڈاکٹر برجیش کمار
ڈاکٹر ونود شرما
ڈاکٹر موہن کمار شرما
ڈاکٹر رادھے شیام
ڈاکٹر کمل کانت

محلّہ مبارک علی

حکیم محمد اسماعیل اجمیری
حکیم سعید احمد اجمیری
حکیم محمد یوسف اجمیری
حکیم محمد یعقوب اجمیری

حکیم اسعد احمد اجمیری	حکیم فخر الحسن	ڈاکٹر فوزیہ اجمیری
حکیم محمد ساعد اجمیری	حکیم محمد شارق اجمیری	حکیم محمد عامر اجمیری
حکیم مسعود احمد اجمیری	حکیم سعد رشید اجمیری	حکیم محمد یاسر اجمیری
حکیم سعود احمد اجمیری	ڈاکٹر محمد اسعاد اجمیری	حکیم محمد فوزان اجمیری
حکیم محمود احمد اجمیری	حکیم محمد مساعد اجمیری	حکیم مریم اجمیری
حکیم ولی اللہ اجمیری	حکیم محمد طٰہٰ اجمیری	حکیم محمد ارشد اجمیری
حکیم اسعد اللہ اجمیری	حکیم محمد طلحہ اجمیری	حکیم محمد امجد اجمیری
ڈاکٹر محمد راشد اجمیری	حکیم فرحا اجمیری	حکیم محمد صفی اللہ اجمیری

سیاست وقیادت

سیاست، وہ زبردست فراست وقوت ہے جس کے وسیلے سے انسان نہ صرف مقصد حیات کو سمجھتا ہے بلکہ اپنے اور دوسروں کے وجود کو وسعت دیتا ہے۔ اپنے اردگرد کے ماحول اپنی نسل اور اپنے خیالات میں محدود ہو کر نہیں رہتا۔ گویا اس کی سوچ، اُس کی فکر، اس کا تدبر آفاقی بن جاتا ہے۔ وہ حال کی روشنی میں مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کائنات کی وسعتوں اس میں پھیلی مخلوق، نشانیوں، علامتوں اور اس کے اسرار و رموز کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے۔ بالکل اس طرح، جیسے کوئی محبوس مادہ اپنے تنگ دائرے سے نکل کر ایک شعاع کی طرح ہر طرف گھومتا ہے یعنی سیاست داں وہ راست رہنما ہے جو مسافروں کو غلط راستہ اختیار کرنے ہی نہیں دیتا اور اس کی اوّلین کوشش ہوتی ہے کہ مسافروں کو ان کی منزل آسانی کے ساتھ مل جائے۔ تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب جب کسی ملک میں کوئی سیاسی تحریک ابھر کر انقلاب کی صورت اختیار کرگئی۔ تو انقلاب لانے والوں نے سب سے پہلے اس ملک کے اقتدار پر قبضہ کرکے قوموں، ملتوں کی تہذیبی روایت، شخصی قانون، ملّی ورثہ، ان کی فکری وقومی خصوصیات، امتیازی نشانات اور علامات کو پامال کیا ہے۔

وہاں کے تعلیمی، ثقافتی، معاشرتی نظام کے ڈھانچے، عادات واطوار مذاق ومزاج اور تصورات کا خانہ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ اس صورت حال کا یہ ردّعمل ہوتا ہے کہ حزب مخالف یا مد مقابل علمی بصیرت کے ساتھ، بلا تصادم و بلا جنگ "مکافات" کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور آئندہ کے لیے تخریبی و غلط تشریحات سے روکتا ہے — اور — صالح اصل و صحت مند سیاست و قیادت کا یہی مقصد و مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی نصب العین کے مدنظر جبر و تشدد کے خلاف انسانیت کے استحصال کی بنا پر انصار بزرگوں نے راجہ گنگ سے جنگ وجدال کیا۔ حضرت قطب العالم نے بابر کے خلاف ابراہیم لودھی کی فوج میں شامل ہو کر پانی پت جا کر حمایت کی۔ مولانا رشید احمدؒ نے ۱۸۵۷ء میں شاملی کے محاذ میں شریک ہو کر اپنے وطن ہندوستان کو بچانے کے لیے انگریزوں سے جنگ کی اور قید و بند کی مصیبت سہی۔ مولانا حسن عسکری نے کالا پانی کی سزا پا کر وطن کی آزادی کے لیے ۱۸۵۷ء میں اپنی جان قربان کر دی۔ ملک وقوم اور معاشرہ کو خرابیوں سے بچانے کا نام ہی اصلی اور واقعی سیاسی فراست اور قیادت ہے — گنگوہ میں برسہا برس سے نمبردار قاضی عبدالقیوم کے خانودے میں سیاسی قیادت چلی آتی ہے۔ چند سالوں کے استثنا کے علاوہ یہاں کا سیاسی اقتدار ہر پھر کے آج بھی قاضی محمد حنیف و قاضی مسعود احمد کے گھر میں ہی مقیم ہے۔ جبکہ دوسری برادریوں اور خاندانوں میں بھی سیاست کے عظیم الشان، نور بار چاند سورج ہوئے ہیں اور ہیں۔

سابقہ اور موجودہ میں سے چند کے نام یہ ہیں:

خواجہ حسین الدین ہراتی، قطب العالم عبدالقدوس، شیخ عبدالنبی قدوسی، مجاہد آزادی مولانا رشید احمد، مولانا حسن عسکری اسیر کالا پانی، مخدوم جہاں قدوسی، ڈپٹی مخدوم احمد، ڈپٹی غیاث احمد، ڈپٹی حافظ محمد ابراہیم، قاضی محمد حنیف، حافظ محمد یوسف، مولانا محمد یعقوب، حکیم محمد یوسف قدوسی، فخر جہاں قدوسی، مختار جہاں قدوسی، امتیاز جہاں قدوسی، حافظ ماجد حسین، پیر جی شبیر احمد، قاضی مسعود احمد، قاضی عبدالحمید، قاضی محمد عمر عرف کلونوری کا، بابو عبداللطیف، صوفی رشید احمد، لالہ رام سروپ، مولانا محمد ایوب، فاروق طاہر، پیر جی نصیر احمد، صوفی حمید احمد، منشی رمضانی قریشی، منشی محمد عمر قریشی، منشی جعفر علی، محمد یحییٰ (سکریٹری)، خواجہ شبیہ الحسن،

بابو، محمد حنیف قریشی، منشی غلام محمد زائر قریشی، رشید احمد قریشی، چودھری محمد یٰسین، ماسٹر امیر اللہ، ماسٹر شمس الدین بشیر احمد راجا، حمید احمد، شریف شیخ، ماسٹر ناظر حسن، حاجی شادی، قاضی محمد ذکریا، حافظ عبدالوحید، حافظ سعید احمد آڑھتیان، لالہ کانتا پرشاد، لالہ اوم پرکاش گھوڑے والے، حافظ سعید احمد، حاجی صدیق احمد، حافظ صدیق احمد، حاجی عبدالعزیز، دیوی چند کمھار، رام بابو وجندر کمار، راشد مسعود، رشید مسعود، قاضی محمد تحسین، پریم چند گویل، چودھری شریف احمد، چودھری فخر الدین، محمود حسن مہتر، حکیم جمیل احمد قدوسی، غلام صابر، حاجی احسان احمد، ذکریا دوکاندار، سرجیت سنگھ سینی، قاضی محمد عیسیٰ، صوفی ظہیر اختر، محمد یوسف نیتا قریشی، سعید احمد تیغ قریشی، محمد حنیف سکریٹری، حافظ محمد حنیف، غلام صابر محلّہ محمد غوری، نعمان مسعود، عمران مسعود، عرفان علیم قریشی، حامد حسن، ڈاکٹر منور نعیم ڈاکٹر ارشاد نعیم، مصطفیٰ ٹھیکیدار ماسٹر محمد یٰسین اکرم، فرقان احمد سیفی، زندہ حسن قریشی، ملا شبیر احمد قریشی۔ سید واجد حسن، سید محمود احمد۔
۱۲ر فروری ۱۹۳۶ء کو پنڈت جواہر لال نہرو حشمت اللہ ڈرائیور محلّہ ٹانکان کی گاڑی میں بیٹھ کر سہارنپور سے گنگوہ آئے اور ۱۹۴۲ء کے بھارت چھوڑو آندولن کے تحت وید بھوشن لالہ سکھدیو سہائے، روڑامل، شیام لعل، سیّد واجد حسن، حافظ محمد یوسف ایوبی، قاضی رفیق احمد و قاضی محمد یحیٰی، سعید احمد، حکم چند، داتا رام، نمک تیاگی وغیرہ لاتعداد حضرات اس آندولن میں گنگوہ سے جیل گئے اور مصیبتوں میں مبتلا رہے۔[1]

اخبارات ورسائل

موجودہ دور ترسیل وابلاغ کا دور ہے۔ کسی بھی قوم کی شناخت اس کے بنیادی اصولوں اور اعمال کی ترقی، ترویج وتبلیغی اشاعت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ کو اپنایا جائے۔ یہی نہیں بلکہ ان ذرائع ابلاغ کا وسیع تر کیا جانا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ جس قوم کے پاس اس کے غیر محدود غیر منتشر ذرائع ہوں گے وہ قوم خود کو زیادہ محفوظ اور زندہ رکھ سکتی ہے۔ اور بہتر طور پر اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتی ہے اردو،

---

۱ آلوک ۱۹۸۰ء، ص ۵۸

ہندی، انگریزی اور اہم علاقائی زبانوں میں اپنے اخبارات ورسائل کا جال بچھانا ضروری ہے۔ اپنی، دینی، تاریخی کتابوں کا ترجمہ لازمی چیز ہے۔ ٹی۔وی چینلوں کا قیام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر دور میں لوگوں نے اپنے گردو پیش کے واقعات وحالات سے باخبر رہنے اور دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ قدیم ہندوستان میں خبروں کی فراہمی اور ان کی دوسروں تک رسائی کا باقاعدہ انتظام تھا۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں خبریں منتقل ہوتی تھیں۔ اس طرح خبر حاکم تک پہنچ جاتی تھی۔ لیکن آج ذرائع ترسیل یعنی خط وکتابت ٹیلی گراف اخبارات، رسائل، سینما، ریڈیو، ٹیلیفون، فیکس ٹیلی ویژن نے بہت ترقی کر لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خبر ذرا سی دیر میں ہی سب جگہ پہنچ جاتی ہے۔ اور ہماری معلومات میں اضافہ کا سبب بن جاتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کو ترقی بخشی ہے وہیں صحافت نے بھی تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے۔ معاشرے کی تشکیل میں ذرائع ابلاغ کا اہم کردار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ذرائع ابلاغ غیر معمولی قوت وتاثیر اور دوررس نتائج کے حامل ہیں۔ ذہن سازی اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے شاید ہی کوئی حربہ اس سے زیادہ کارگر ہو۔ یہ قوت انسان کو فلاح و بہبود اور راحت واطمینان سے شادکام کر سکتی ہے۔ آج علوم وفنونِ سائنس وٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی نے علوم سے رابطہ کے ذریعوں کو فلم کے پردے، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، کمپیوٹر، اخبار، موبائل، رسائل، ریڈیو جیسے لاسلکی آلات پر مرکوز کر دیا ہے۔ جو اپنے اندر شدید قسم کی متاثر کرنے والی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علاقائی اور جغرافیائی فاصلے کچھ اتنے کم ہو گئے ہیں کہ دنیا ایک ''عالمی گاؤں'' بنتی جارہی ہے۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ نئے نئے تقاضوں کے تحت گنگوہ سے بھی مندرجہ ذیل اخبارات ورسائل نکلتے رہے ہیں اور فی الحال بھی نکل رہے ہیں جبکہ یہاں قدیم وجدید کتابت اور جدید طباعت کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے۔ مگر باحوصلہ اہلِ علم پھر بھی اس کانٹوں بھرے راستہ پر بے خوف وخطر اپنی دھن میں رواں دواں ہیں۔ تعجب ہے کہ محلّہ قریشیان سے ایک قلمی ماہنامہ 'سلامتی' مدتوں پابندی کے ساتھ نکلتا رہا۔

شمار	اخبار یا رسالہ	زبان	ایڈیٹر	کیفیت
۱	سلامتی قلمی ماہنامہ	اردو	ڈاکٹر ادیب وغیرہ	
۲	اجتماع ہفتہ وار	״	مولوی محمد یوسف	مولوی محمد صاحب
۳	جہاں نما ماہوار	״	آزاد انور ایوبی	
۴	شانِ نگارش پندرہ روزہ	״	صوفی ظہیر اختر	
۵	جمال قدوس پندرہ روزہ	״	صوفی ظہیر اختر	
٦	شمع خیال ماہوار	״	صوفی ظہیر اختر	
۷	گنگوہ میسج ہفتہ وار	ہندی	صوفی ظہیر اختر	
۸	پشپ کنج ہفتہ وار	״	صوفی ظہیر اختر	
۹	یوتھ لیڈر پندرہ روزہ	״	پرمود گویل	
۱۰	پریم آنچل پندرہ روزہ	״	بلبیر توم	
۱۱	عالم ٹائمز ہفتہ وار	״	شبیر عالم	
۱۲	گنگوہ سماچار	״	جتیش رجین	
۱۳	کرانتی گاتھا	״	شری رام گپتا	
۱۴	آئینۂ گنگوہ	״	منموہن شرما	
۱۵	قلم نہیں بکے گی	״	جتیندر شرما	
۱٦	ٹرانسپورٹ وارتا	״	پرمود بھارتی	
۱۷	اٹل وانی ایکسپریس ہفتہ وار	״	جتیندر شرما	

گنگوہ کی تعلیم گاہیں

جب سے میں نے ہوش کی آنکھیں کھولی ہیں یہاں کے بہت سے محلوں میں جن میں مسلم اکثریت تھی حفظ و ناظرہ کلام پاک کے اچھے خاصے مکتب دیکھے ہیں۔ ان میں طلبا کی تعداد محدود ہوتی تھی اور یہ کسی مجلس منتظمہ کے تحت نہیں ہوتے تھے بلکہ اُن کے معلم ہی تنہا ان کے منتظم ہوتے تھے البتہ دو بڑے مکتب یا چھوٹے مدرسے ضرور اُس وقت ایسے تھے جو کسی انتظامیہ کے تحت تھے۔ ان میں سے اوّل مدرسہ حیات ملیہ محلّہ قریشیان، دوم مدرسہ نورالاسلام محلّہ ٹانکان۔ دونوں ادارے ۱۹۴۲ء میں قائم کیے گئے تھے۔ جو محدود طور پر مختصر قرآنی اور اردو میں دینیات کی ابتدائی تعلیم دیتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں جو مکتب یہاں موجود تھے ان کی تفصیل یہ ہے اور ان مکتبوں میں حفظ کلام پاک کی تعلیم پر زیادہ توجہ رہتی تھی۔

(۱) درگاہ حضرت شیخ محمد صادق محبوب الٰہی قدوسی محلّہ مبارک علی میں محترم حافظ عبدالرحمنؒ کا مکتب۔

(۲) محلّہ اشرف علی خندق کے قریب حضرت حافظ بندوؒ نابینا کا مکتب اُن کے مکان میں۔

(۳) محلّہ اشرف علی باہرلی مسجد میں استاذنا حضرت ملا عبدالرحمنؒ موذن باہرلی مسجد کا مکتب۔

(۴) لال مسجد محلّہ بہاؤالدین میں حضرت مولانا فخرالدینؒ عرف بڑے مولوی صاحب کا مشہور مکتب۔

(۵) مسجد قاضی والی محلّہ غلام صابر میں ولی کامل حضرت حافظ بندوؒ کا مکتب۔ جس کے فیضیافتہ نامور علماء، محدث و مفتی اور عالم و فاضل ہوئے ہیں۔

(۶) جامع مسجد بازار نزول حال صرافہ بازار میں حافظ عبدالکریم کا مکتب۔

(۷) محترم و مکرم حافظ مولا بخشؒ نابینا کا مکتب مسجد محلّہ ٹانکان بڑ تلے والی میں۔ ان مکتبوں سے لاتعداد ناظرہ خواں اور بے شمار حافظ بن کر نکلے۔ جنھوں نے آنے والی نسلوں کے ہزاروں سینوں میں یہ قرآنی نور منتقل کیا۔ ان مکاتب کے معلمین بظاہر معمولی انسان نظر آتے تھے ورنہ حقیقت میں یہ قطبوں، محدثوں اور باعمل

عالموں کے صحبت یافتہ تھے اور ایک سے ایک بڑھ کر اہل دل، اہل نظر حق آگاہ، روشن ضمیر اولیاء اللہ اور صاحب نسبت افراد تھے۔

گنگوہ میں مسلمانوں کی مستقل رہائش کے بعد میری معلومات میں صرف خانقاہ قدوسیہ ہی اس قصبہ میں سب سے بڑا تربیتی، تعلیمی اور روحانی ادارہ تھا۔ حق تو یہ ہے کہ اُس وقت یہ تمام قصبہ ہی کامل واکمل قدوسی مدرسہ تھا۔ قطب عالم کے بعد آپ کی اولاد واخلاف نے مدتوں اس فریضہ کو بخوبی انجام دیا اور خانقاہ کے ایک حصہ کو "مدرسہ عالیہ قدوسیہ" کا نام دے دیا۔ مدتوں باقاعدگی کے ساتھ یہاں اعلیٰ تعلیمی سلسلہ بخوبی چلتا رہا۔ مگر ۱۸۰۰ء کے بعد گنگوہ میں قطب عالم کا عرس ہونے لگا اور اس عرس کو بتدریج عروج حاصل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اِس ماحول پر سجادگی وعرسیت حاوی ہوگئی اور تعلیم وتدریس پیچھے رہ گئی۔ حالات وماحول میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ خانقاہ اور مدرسہ ویران ہوگئے۔ درسگاہیں اور اقامت گاہیں رفتہ رفتہ گرتی گئیں۔ بروقت مرمت ودیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے یہ ادارہ کھنڈر میں تبدیل ہوکر ویرانیوں کی بھول بھلیّوں میں گم ہوگیا۔ قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ یہاں ۱۵۲۶ء میں تشریف لائے۔ آپ کے وسیلے سے گنگوہ کے درو بام تعلیم وتصوف کی روشنی سے جگمگا اٹھے اور یہ نورانی وروحانی فضا دوسو چوہتر سال تک قائم رہی۔ ہاں چالیس پچاس سال تک یہ روشنی دھیمی ضرور رہی مگر گل نہ ہوسکی کہ ۱۸۰۰ء کے ربع آخر میں قطب زماں حضرت مولانا رشید احمدؒ کا زمانہ آگیا۔ آپ نے قدوسی خانقاہ میں قیام فرمایا اور قطب العالم کی مسجد کو آباد کیا۔ درسگاہیں اور اقامت گاہیں درست کرائیں۔ قرآن کریم، حدیث وفقہ، طریقت ومعرفت کا درس پہلے سے زیادہ شدومد کے ساتھ شروع ہوگیا۔ گنگوہ اور اس کے اطراف اکناف میں وہی قدوسی رنگ دوبارہ چھا گیا گویا قدیمی عہد زریں واپس لوٹ آیا۔ سارا ماحول دینی تعلیم اور روحانیت وتصوف کی دلکش صداؤں سے معمور ہوکر رہ گیا۔ یہی نہیں بلکہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۱۰ء کے قریب یہاں کے حضرات نے دنیوی تعلیم کی طرف بھی توجہ مبذول کی اور ایک پرائمری اسکول کوٹ پر موجود دفتر میونسپل بورڈ کی عمارت میں۔ ایک مڈل اسکول موجودہ ہیروز میموریل اسکول کی عمارت میں ایک میٹرک اسکول موجودہ بازار پنبٹھ میں چھوٹا کالج قائم کرائے۔

مدرسہ اشرف العلوم

حضرت مولانا رشید احمدؒ کی وفات ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔ آپ کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہاں رشیدی ماحول کا اثر باقی رہا مگر جب جسم سے روح ہی روانہ ہوگئی تو جسم ہی کیا باقی رہتا۔ چنانچہ آپ کے وہ متوسلین جو یہاں مقیم تھے اپنے اپنے مقامات پر چلے گئے تو نورانیت کی رہی سہی رمق بھی نابود ہوگئی۔ بے عملی کی عجیب سی ویرانی چھا گئی ہر طرف ہو کا عالم ہوگیا۔ عظیم علمی مرکز کی جگہ چند چھوٹے چھوٹے مکتب ضرور باقی رہ گئے۔ اسی طرح قریباً چالیس سال گزرے کہ ۱۹۴۴ء میں مولوی محمد ابرہیم گنگوہی نئے نئے یہاں پڑھ کر آئے تھے تو نیا نیا جوش وولولہ تھا آواز میں رس تھا اور تقریریں جذباتی، اسلامی تھیں اس لیے تقاریر کی پذیرائی کا سلسلہ مسجدوں اور محلوں میں دراز تر تھا۔ انھیں اسلامی جذباتی تقریروں نے لوگوں کے دِلوں میں دینی وعلمی چنگاری کو بھڑکا کر شعلہ بنادیا اور کسی علمی ادارہ کے قیام کی تحریک وتجویز سامنے آگئی۔ سب سے پہلے محلّہ اشرف علی کے چند خوش نصیب سامنے آئے جن میں الحاج حافظ محمد اسماعیل اعزازی امام باہرلی مسجد، بشیر احمد پہلوان، محمود احمد مولوی مسعود کے والد، منشی محمد قاسم، محمد قاسم مولوی محبوب احمد کے والد، حافظ محمد زکریا، ملا بشیر احمد دوکاندار، الحاج ملا عبدالرحمٰن خیالباز، الحاج ٹھیکیدار ہاشم علی، الحاج حافظ حسام الدین، مولانا محمد اسماعیل، الحاج غفور احمد انجن والے وغیرھم پیش پیش تھے، حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی کے مشوروں اور رہبری میں۔ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے ناظم مشہور عالم وبزرگ حضرت مولانا عبداللطیف کے دست مبارک سے مدرسہ اسلامیہ عربیہ کی بنیاد پڑی۔ چونکہ یہ مدرسہ باہرلی مسجد محلّہ اشرف علی میں ہے، اس لیے محلّہ کی رعایت سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے منسوب کرکے مدرسہ کا نام ''اشرف العلوم'' تجویز ہوا۔ چند حضرات پر مشتمل ایک مجلس منتظمہ بناکر صدر، خزانچی طے کردیے گئے حاجی حافظ محمد اسماعیل، کو مہتمم وناظم مقرر کرکے کام شروع کردیا گیا۔ الحاج حافظ حسام الدین، حافظ حبیب احمد گنگنی، مولوی محمود احمد

کتب فروش، استادنا ملا عبدالرحمٰن مؤذن باہر لی مسجد، کو مدرسین بنائے گئے۔ حضرت ملا عبدالرحمٰن کا باہر لی مسجد میں لاتعداد طلباء پر مشتمل مشہور مکتب تھا۔ راقم الحروف اس وقت اس مکتب میں ناظرہ کلام پاک پڑھتا تھا اسی مکتب کے بچوں کو درجہ وار ترتیب دے کر ان مدرسین پر تقسیم کردیا گیا تھا۔ کچھ مدت بعد حضرت شیخ مولانا حسین احمدؒ مدنی جب گنگوہ تشریف لائے تو بطور برکت حضرت کے ہاتھوں بھی دوبارہ مدرسہ کی بنیاد کی تجدید کرائی گئی۔

گنگوہ کی فضا پہلے سے ہی تعلیمی رہی ہے اس لئے نئے مدرسہ کی قبولیت و پذیرائی بہت جلد ہوئی طلبا کی زبردست زیادتی کی وجہ سے مزید مدرسین اور مزید درسگاہوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو باہر لی مسجد کے فرش کے علاوہ اسی احاطہ میں بہت سی فاضل زمین پڑی ہوئی تھی اس کے مشرقی حصہ میں طویل وعریض پانچ درسگاہیں تعمیر کی گئیں اور حضرت مولانا غلام یزدانی کیملپوری پشاوری شاگرد رشید حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی، مولانا محمد اسماعیل سکنہ محلّہ اشرف علی، مولانا عبدالحمید داناپوری بجنوری، مولانا عبدالحمید حسن پوری ضلع مرادآباد اور ایک نابینا مدرس کا تقرر کیا گیا جو موضع قطب پور گسائی متصل شہر سہارنپور کے تھے۔ اس دوران چند ماہ کے بعد مشہور قاری شریف احمد سکنہ روڑکی ثم سہارنپوری کا تقرر ہوا۔ مولانا غلام یزدانی اپنی بے پناہ علمی صلاحیت دینی قابلیت، ذاتی محاسن اور اعلیٰ انتظامی بصیرت کی وجہ سے صدرالمدرسین قرار پائے۔ آپ نوجوانی میں ہی نمونۂ السلف بقیۃ الصالحین تھے۔ آپ کی زندگی علمی، دینی، ملی، مجاہدانہ اعمال وافکار کی حامل تھی۔ تقریر پُرجوش عالمانہ مجاہدانہ، غازیانہ، رہن سہن، کھانا، پینا، پہننا بزرگوں کے طور وطریق پر تھا۔ انداز بیان عامیانہ اور مصلحانہ، معاملات وشیوہ مخلصانہ، گفتگو مشفقانہ، طرز وانداز والہانہ، ہر ہر لمحہ کتاب وسنت کے مطابق۔ آپ کے دور میں یہاں ایسی علمی، روحانی، دینی، اصلاحی فضا قائم ہوئی کہ قدوسی ورشیدی زمانوں کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ نماز فجر کے بعد مولانا ترجمہ و تفسیر کلام الٰہی کی بزم ہر روز سجاتے تھے جس میں گنگوہ کے علاوہ دیہات سے بھی عاشقان قرآن کریم جوق در جوق شامل ہوتے تھے اور قصبہ میں بھی باہر بھی ہر جمعرات کو تبلیغی تقاریر کا سلسلہ بھی تھا یہی سبب تھا کہ ماحول ایک دم علمی بن گیا تھا۔ مگر ۱۹۵۰ء کے آخری ماہ میں آپ

برائے شادی اپنے گھر تشریف لے گئے تو پھر واپس نہ آ سکے کیونکہ ایک تو نئی نئی شادی اور
مصروفیات دوسرے ہندو پاک میں بارڈرز بن گئے تھے جن کی وجہ سے بلا پاسپورٹ اور
ویزا، آنا جانا بند ہوگیا۔ مولانا غلام یزدانی مدظلہ کے بعد مولانا عبدالمجید حسن [illegible]
صدر مدرسین طے ہوئے۔ جن طلبا نے مولانا غلام یزدانی کے پاس کلام پاک حفظ کیا تھا
ان پندرہ سولہ طلبا نے یہیں مدرسہ میں ابتدائی عربی وفارسی کی کتابیں پڑھنا شروع کر دی تھیں
اور کچھ طلبا باہر جاکر مزید تعلیم کے لیے دیگر مدارس میں داخل ہوگئے تھے۔ احقر نے بھی
حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے حکم پر مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں مزید تعلیم کے لیے
داخلہ لے لیا تھا۔ بعد ازیں مولانا قاری شریف احمد گنگوہی مدرسہ میں تشریف فرما ہوئے
چند سالوں میں ہی آپ کی توجہ اور کوششوں سے مدرسہ زمین سے آسمان پر پہنچ گیا۔ ۱۶؍ مارچ
۲۰۰۲ء تا ۱۴؍ مارچ ۲۰۰۳ء کی روئداد مندرجہ ذیل ہے۔ مقامی و بیرونی طلبا ۱۳۷۳ کل مدرسین
۵۱ کل عملہ ملازمین ۱۶ ہیں۔ اس سال ۱۰ مفتی بنے ۸۳ طلبا نے مولویت کی سند حاصل کی۔ ۲۰
حافظ ہوئے۔ ۸۷ طلبا نے قرأت کی ڈگری لی، ۹۱ بچوں نے ناظرہ کلام پاک پڑھا۔ ۱۶ لڑکوں
نے درجہ پانچ پاس کیا ہے۔ اس سال کی کل آمد پچپن لاکھ اکیس ہزار ساٹھ روپے اور کل خرچ
پینتالیس لاکھ پچاسی ہزار آٹھ سو چون روپے رہے۔ باہر لی مسجد والا مدرسہ آج کل مدرسہ قدیم
کہلاتا ہے اور جدید مدرسہ سہارنپور بس اسٹینڈ پر اپنی طویل وعریض شاندار عمارت میں موجود
ہے جس کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد وسیم سنسارپوری ثم گنگوہی ہیں۔ تین جگہوں پر
مدرسے کی تین شاخیں بھی ہیں۔ اللہ مزید ترقی عطا فرمائے آمین۔

جامعہ رشیدیہ
تعلیمات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا منفرد مرکز

مغل اعظم شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے چیف جسٹس حضرت مولانا شیخ عبدالنبی
قدوسی گنگوہیؒ کے ''باغِ انار'' کو آج کل محلہ انارکلی کہا جاتا ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں اس

جگہ کو ایسی حالت میں دیکھا کہ یہاں ایک طویل وعریض رقبہ میں پرانے اناروں کے ختم ہوتے ہوئے موٹے تنوں والے انار کے پیڑ تھے اور بہت سی ایسی جڑیں دیکھیں کہ جن میں آج بھی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور یہ تمام رقبہ اِن تنوں، جڑوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے پٹا پڑا ہے۔ اس جنگل نما باغ کے بالکل درمیان میں ایک قدیمی لمبی چوڑی مسجد تھی جس کی چھت لکڑی کی کڑیوں کی تھی۔ یہ مسجد ویران، بوسیدہ، افتادہ اور غیر آباد پڑی ہوئی تھی، یہ نماز پڑھنے کے قابل نہ تھی کیونکہ چھت جگہ جگہ سے خستہ ہوکر گر گئی تھی اور اس میں بہت سے سوراخ ہوگئے تھے فرش خراب ہو چکا تھا۔ دراصل یہ جگہ آبادی سے بھی الگ تھلگ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب حضرت شیخ عبدالنبی دہلی سے یہاں تشریف لاتے ہوں گے تو اپنے باغ میں زیادہ وقت گزارتے ہوں گے اُس وقت یہ جگہ آبادی سے دور تھی اور سرائے قطب العالم مختصر سی آبادی تھی۔ تاہم ۱۵۲۶ء سے ۱۹۱۰ء تک یہاں کے حالات بہت اچھے تھے، قدوسی ریاست تھی قدوسی دبدبہ تھا امارت تھی خوشحالی تھی فراغت تھی قدوسیت کے بعد رشیدی دربار کی زیب وزینت تھی، علم وعمل کے جشن تھے اہل دانش کا ہجوم تھا اس لیے سرائے قطب العالم ساری دنیا کی توجہ کا مرکز تھی۔ یہ غیر آباد مسجد حضرت شیخ عبدالنبی کی مسجد ہے جو گنگوہ کے سب سے پہلے محدث اور فقیہہ تھے اور سارے ہندوستان کے تنہا قاضی القضات اور مفتی تھے۔ سرائے میں عربی اسلامی مدرسہ کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہورہی تھی حالات بدل رہے تھے آبادی بڑھتی جارہی تھی لوگوں میں تعلیمی رجحان بڑھتا جارہا تھا۔ چشم بینا اِس علاقہ پر مرکوز ہوئی اور احساس ہوا کہ کوئی اس قیمتی جگہ کو غصب نہ کرلے اس لیے بھی حضرت مولانا رشید احمد کے پوتے مولانا حکیم عبدالرشید محمود عرف ننومیاں نے مولانا مولوی محمد یوسف منصوری سے فرمایا کہ ''میاں یوسف اس مسجد کو آباد کرو اور یہاں مدرسہ بھی قائم کرو۔'' مولانا یوسف نے تعمیل حکم میں کیا کیا مصیبتیں جھیلیں، کن کن پریشانیوں میں مبتلا رہے کتنی دماغی، قلبی اور جسمانی دقتیں اٹھائیں یہ تو کوئی ان کے دل سے پوچھے کیونکہ ان کے پاس زر تھا نہ پر۔ اور نہ کوئی ہم خیال۔ جس آدمی کو تن تنہا اور سرمائے کے بغیر، زمین وجگہ کے بغیر مدرسہ بنانا ہو اس کی پریشانیوں پر سوچئے کہ وہ کس کس طرح اس مشکل سے نکلا ہوگا کہ طویل وعریض شاندار عمارت بن کر تیار ہوگئی ہو۔ ایک ادارہ پہلے سے قائم

ہے،اس کا عملہ ہے،اس کے پاس اس کی عمارت ہے،سرمایہ ہےاس کی ایک مجلس منتظمہ ہے اگراس کا کسی کو ناظم بنادیا جائے تو ناظم کو کیا پریشانی ہوسکتی ہےاس کے چلانے میں مگر یہاں معاملہ برعکس تھا یہاں جگہ تھی مگر وہ ایک طویل جنگل تھا۔اس کو صاف کرا کر رہائش کے قابل بنانا تھا۔جبکہ وسائل اور ذرائع سرے سے ہی نابود تھے۔مگر ہمت مرداں مدد خدااور یقین محکم، عمل پیہم کے سہارے سب سے پہلے مولانا نے یہاں کے قریبی ناہموار دماغوں کوتعلیم کی اہمیت بتا کر ہموار بنایا پھراس تعلیمی ادارہ کی ضرورت کے لیےذہن سازی کی مہم شروع کی۔سر دست قرض لے کر کام کی ابتدا کی۔اگر چہ اس سے مولانا کی تذلیل بھی ہوئی تاہم مولانا نے ہر وہ کام کیا جو مدرسہ بنانے میں معاون ہوسکتا تھا۔آخر کار حالات وجگہ ہموار ہوئی۔حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی مولانا حکیم عبدالرشید محمود مولانا محمد میاں قدوسی،مولانا حکیم شفیق احمد قدوسی، خواجہ شبیہہ الحسن،شاہ محی الدین علی قدوسی وغیرھم نے ۱۶رشوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۲ء میں ادارہ کی بنیاد رکھی اور مدرسہ کا نام ''رشیدیہ'' تجویز ہوا۔مولانا محمد یوسف کی محنت،لگن،خلوص، للّٰہیت کا ہی نتیجہ ہے کہ آج مدرسہ رشیدیہ نزدیک ودور سارے ہندوستان میں ہی نہیں بیرون ملک بھی مشہور ہے۔آج اس کی طویل وعریض معقول عمارت ہے۔دیندار،محنتی،قابل عملہ ہے اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ گنگوہ میں یہ تنہا عربی مدرسہ ہے جس میں مسلم بچیوں کے لیے باقاعدہ شعبۂ نسواں قائم ہے۔جہاں پونے دوسولڑکیاں قابل استانیوں کے زیرسایہ تعلیم حاصل کررہی ہیں۔مدرسہ رشیدیہ کا کنبہ فی الحال تین سوافراد پر مشتمل ہےاوراس بڑے کنبہ کی تمام روزمرہ کی گھریلوضرورتوں کا بخوبی انتظام ہے۔۱۴۲۳ھ مطابق ۲۰۰۳ء کی مجمل تفصیل یہ ہے: مقامی وبیرونی طلبا وطالبات کی تعداد سات سو ہے، مدرسین وملازمین کی تعداد چھبیس ہے کل آمد دس لاکھ پینتیس ہزار چھ سوتینتیس روپے ہےاورکل خرچ پندرہ لاکھ ستاون ہزار آٹھ سو اٹھاسی روپے ہے۔پانچ لاکھ بائیس ہزار دوسوروپے قرض ہے۔مدرسہ مقروض ہے تاہم تعداد طلبہ کے تحت تعمیرات کا سلسلہ جاری ہےاور دوسری جگہوں میں مدرسہ کی شاخیں بھی قائم ہورہی ہیں۔اللہ تعالیٰ مدرسہ کودن دونی رات چوگنی ترقی پائے اورمولانا محمد یوسف کومزید حوصلہ عطافرمائے آمین۔

جامعہ احمد العلوم خانپور گنگوہ

اور مدرسہ عربیہ اسلامیہ بوڑھن پور گنگوہ

جس وقت انصار کے ہاتھ میں گنگوہ کی حکومت آئی تو انصار نے بطور حفاظت گنگوہ کے چاروں طرف حفاظتی چوکیاں قائم کیں۔ اُس زمانے میں شہر کے چاروں طرف چوکیاں قائم کرنا بھی ایک دفاعی طریقہ تھا۔ چونکہ گنگوہ کی فوج افغانیوں اور غوریوں پر مشتمل تھی اور ان دونوں شہروں کے لوگوں کو ''خان'' کہا جاتا ہے اس لیے گنگوہ کے چاروں طرف ''خانپور'' کے نام سے چار مختصر سی آبادیاں بسادی گئیں تاکہ فوجیوں کے بیوی بچے بھی وہیں رہا کریں اور شہر میں آنے جانے کی دقت محسوس و باقی نہ رہے۔ اس وقت بھی گنگوہ کے شمال وجنوب میں دو زبردست آبادیاں خانپور کے نام سے موجود ہیں اور دو مغربی شمال وجنوب کے خان پور اتفاق سے گردش وصدمہ ماہ وسال سے نابود ہوگئے ہیں۔ عجیب بات ہے موجودہ دونوں خانپوروں میں گوجر آباد ہیں۔

جنوب مشرقی خانپور میں ہندو گوجر آباد ہیں اور مشرقی شمال خانپور میں مسلمان گوجر آباد ہیں۔ ''خان پور مسلمانان'' میں قرآنِ کریم اور حدیث پاک کی تعلیم کا ایک زبردست قدیمی ادارہ ''جامعہ احمد العلوم'' کے نام سے مشہور ومعروف ہے جو اپنی طویل وعریض شاندار عمارت میں ایک متعد بہ عملے کے ذریعہ تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ ادارہ قریباً ۱۹۰۰ء کے ابتدائی ایام کا قائم شدہ ہے۔ اس ادارہ کی تعلیمی خدمات بے شمار ہیں۔ یہاں شرح جامی تک تعلیم ہوتی ہے۔

مدرسہ اسلامیہ عربیہ بستان العلوم
(بوڑھن پور گنگوہ)

خانپور مسلمانان کے مغربی گوشہ کو بوڑھن پور کہتے ہیں جس کا نام بڈھا انصاری گنگوہی کی نسبت پر ہے۔ یہ آبادی سہارنپور، روڈ تک آگئی ہے بلکہ روڈ سے مغرب میں بھی کافی بڑی آبادی ہوگئی ہے۔ لب سڑک ایک نئی مسجد تعمیر کرنی پڑی ہے کیونکہ پہلی مسجد کافی دور ہوگئی تھی۔ مگر اس نئی آبادی کے لیے ایک دینی مدرسہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ لہذا احمد العلوم کے ایک طالب علم مولانا ریاض احمد خانپوری نے اپنی ذاتی صلاحیت، جدوجہد، محنت اور لگن سے کتاب وسنت کی تعلیم کے لیے ایک معقول عمارت میں دینی ادارہ قائم کردیا ہے اور اس وقت وضرورت کو رفع کردیا ہے اس سال ۷ حافظوں نے درجہ حفظ سے فراغت حاصل کی۔ ماشاءاللہ یہ ادارہ مولانا کی سرپرستی میں بتدریج روز بروز تعلیمی ترقی کی طرف رواں دواں ہے۔ گنگوہ میں بدلتے حالات اور وقت کے نئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ دینی ودنیوی تعلیم کے مکتبوں، مدرسوں، اسکولوں اور کالجوں کا جال سا پھیلا ہوا ہے۔

قریب قریب گنگوہ کی ہر مسجد میں مکتب موجود ہے۔ اس کے علاوہ علیحدہ علیحدہ جگہوں پر مندرجہ ذیل مدرسے تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مدرسہ حیات ملّیہ محلّہ قریشیان مدرسہ انوار العلوم مسجد پیرزادگان محلّہ غلام اولیاء، مدرسہ محمودیہ محلّہ غلام صابر، مدرسہ فخریہ لال مسجد محلّہ بہاؤالدین، مدرسہ نورالاسلام محلّہ ٹانکان، مدرسہ عالیہ قدوسیہ محلّہ مخدوم جہاں، مدرسہ اسلامیہ متصل مزار حضرت مولانا رشید احمد نئی آبادی مدرسہ مدرستہ البنات نئی آبادی محلّہ کوٹلہ، میونسپل بورڈ کے تحت چلنے والے بہت سے پرائمری اسکول موجود ہیں۔ دیگر قابل ذکر تعلیمی ادارے یہ ہیں۔ ایچ آر انٹر کالج، پورن مل رام لال ڈگری کالج، جگرناتھ انٹر کالج، کنور شوبھت انجینئرنگ کالج، کنور شوبھت ہاسپٹل ومیڈیکل کالج، این آر موڈرن ہائی اسکول، ہیروز میموریل ہائی اسکول، ڈی اے وی ہائی اسکول اور تین لڑکیوں کے کالج آریہ کنیا انٹر کالج، راشٹریہ کنیا انٹر کالج، بالاجی کنیا ہائی اسکول وغیرہ وغیرہ۔ ■■

گنگوہ کا ایک عظیم انجینئر
(سر سلیمان قدوسی)

دنیا میں اَرْبوں کھربوں انسان ایسے ہوں گے جو علم وفن، عقل وفراست، بصیرت، تدبر، تفکر، دانشوری، ہنرمندی، علمیّت، قابلیت، صلاحیت وغیرہ میں یکتا ولاثانی ہوئے ہیں اور آئندہ ہوتے رہیں گے۔ مگران میں وہ لوگ قیامت کے آنے تک مشہور وممتاز رہیں گے جن کے اعمال، افکار، شاہکار ذہنی ودماغی کاوشیں بہت ہی اچھی، لاجواب، انوکھی، اچھوتی اور اعلیٰ، افضل اور دوامی ہوں گی۔ تاہم ایسی کاوشیں بھی صرف دنیا جہان کے قیام تک ہی اپنے فنکاروں کو تابندہ وزندہ رکھ سکتی ہیں جب کہ اصل وواقعی کاوش تو وہ تصور کی جانی چاہیے جو اپنے خالص ومخلص فنکار کو عالم آخرت میں بھی سُرخروئی سے ہمکنار کراسکے۔ مگر دنیا میں ایسے نادرالوجود حضرات خال خال ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک نام سر سلیمان قدوسی کا بھی ہے کہ تاقیامت سرفراز ہوتا رہے گا۔ اور آخرت میں بھی انشاء اللہ معزز ومکرم رہے گا ـــــ گنگوہ میں یوں تو ایک سے ایک قابل، نام آور اور دیدہ ور اشخاص ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے ہر فرد وبشر کے کارہائے نمایاں جداگانہ اہمیت کے حامل ہیں سب کے لیے اک دفتر عظیم چاہیے اسی لیے مختصراً عرض ہے کہ صرف یہاں سر سلیمان قدوسی کے ایک کارنامہ کا تذکرہ درکار ہے، ضمناً ملاحظہ فرمائیے ڈپٹی عبداللطیف فریدی کے والد خان بہادر شیخ احمد حسن فریدی اعلیٰ دماغ واعلیٰ قابلیت کے حامل ریلوے انجینئر تھے۔ ایسی دستاویزات اور تمغات موجود ہیں کہ ملک میں ریلوے پُل لاتعداد آپ کے نقشوں اور آپ کی نگرانی میں تیار ہوئے ہیں جن میں سے خاص طور سے دہلی میں جمنا کے اوپر لوہے کا عظیم الشان ریلوے پل آپ نے ہی اپنے نقشہ کے مطابق تعمیر کرایا تھا۔ ایسے ہی شیخ مظہر حسین فاروقی مولانا حافظ قاری حکیم شفیق احمد قدوسی کے خسر تھے، ریاست بھوپال اور ریاست حیدرآباد میں مدتوں اوورسیر اور انجینئر متعین رہے ہیں۔ دونوں ریاستوں میں زیادہ تر سرکاری عمارتیں آپ کے تیار کردہ نقشوں پر تعمیر ہیں۔ آپ کی بہتر کارکردگی کی وجہ سے دہلی

میں محکمۂ تعمیرات نے چیف انجینئر کا عہدہ پیش کیا۔ ریٹائرمنٹ تک قرول باغ دہلی میں قیام رہا۔ بعدازیں اپنے گھر گنگوہ تشریف فرما ہے ——— اسی نہج کی ایک اور قابل قدر اور عجوبہ روزگار فرد وحید شخصیت شاہ شجاع الحق قدوسی کا نامِ نامی ہے آپ مولانا مولوی مفتی ضیاء الحق قدوسی کے فرزند ارجمند ہیں۔ ابتدائی تعلیم گنگوہ میں ہی حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے اور وہاں سے انجینئرنگ کی ڈگری امتیاز کے ساتھ لے کر آئے۔ اور ہندوستان میں ریلوے کے انجینئر مقرر ہوئے۔ دورانِ ملازمت حیدرآباد میں قیام رہا۔ ہندوستان میں ریلوے کے کئی قابل دید اور یادگار پُل آپ کی اعلیٰ دماغی کی دین ہیں۔ پاکستان منتقل ہوئے تو وہاں پاکستان ریلوے کے چیف انجینئر قرار دیے گئے ——— خان بہادر سر سلیمان قدوسی ——— انگریزی دورِ حکومت میں چیف انجینئر کے عہدہ پر سرفراز تھے، اُس وقت یہ ایک بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ دہلی میں پارلیمنٹ ہاؤس، راشٹرپتی بھون اور کناٹ پلیس کے نقشے آپ کے ہی ذہن کے تخلیق کردہ حسین وخوبصورت نقش ہیں۔ دہلی کی سرزمین پر یہ دونوں آپ کی دیکھ ریکھ اور انتظام میں تعمیر ہوئیں دونوں عمارتوں پر آپ کے نام کی پلیٹیں آج بھی لگی ہوئی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں آپ پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں محمد علی جناح کے مقبرہ کا نقشہ بھی آپ کا ہی تشکیل کردہ ہے۔ مگر یہ تو وہ قابل فخر فرد اور گنگوہ کا وہ مایۂ ناز سپوت ہے جس کو رسول مقبول سرورِ عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ مبارک کے ''گنبد خضرا'' کے شگاف کی مرمت ودرستگی کی سعادت حاصل ہے۔ دیگر تعمیرات تو ہیچ ہیں۔

واقعہ یوں ہے کہ صدمۂ زمان ومکان کی وجہ سے گنبد خضرا میں دراڑ پڑ کر شگاف بن گیا تھا۔ حکومت سعودیہ نے دنیائے تعمیرات کے ماہر انجینئروں کو گنبد کا معائنہ کرایا۔ لیکن سب نے اس کو منہدم کر کے از سر نو تعمیر کا مشورہ دیا۔ آخر کار انڈیا گورنمنٹ کے ذریعہ سر سلیمان کو بُلایا گیا۔ آپ نے اوّل غسل کیا پھر دو رکعت نمازِ نفل ادا کی پھر جھولے کے ذریعے شگاف کا معائنہ کیا۔ یہ شعار دینی دیکھئے کہ غسل ونماز نفل کے بغیر جھولے پر قدم نہیں رکھا اب محبت رسولؐ اور خدمت رسولؐ کی راحت کی خوشی میں آنسو بہاتے ہوئے نہایت عجز وانکسار اور خلوص سے عرض کیا ۔

یہ گنہگار کہاں، خدمت سرکار کہاں

معائنہ شگاف کے بعد مغموم دل بادشاہ کو مژدہ سنایا کہ گنبد کو منہدم کیے بغیر انشاء اللہ شگافِ گنبد کی مرمت ودرستگی ہوجائے گی اور بحمد للہ ہوا بھی ایسا ہی۔ بادشاہ نے شاد ہوکر فرمایا: ''مانگئے، کیا معاوضہ ہوا آپ کا'' سرسلیمان نے عرض کیا: ''میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ میرے ہاتھوں نے سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ کے گنبد کو چھونے کی سعادت حاصل کی اور گنبد خضرا کے معماروں میں میرا نام بھی آگیا۔ اللہ پاک سے امیدوار بخشش ہوں اور کوئی طلب نہیں۔''

باباہری داسؒ

باباہری داس، انسانیت کے بےلوث، مخلص، ہمدرد، خیرخواہ، نیک دل، خداپرست اور خدا آگاہ انسان تھے۔ یہ حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کے ہم عصر، ہم راہی اور ان کے یہاں حاضر باش تھے۔ ۱۵۲۶ء سے آج تک ان کے بارے میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں یہ بات مشہور ہے کہ باباہری داس خدمت خلق، خداترسی، نیک نیتی پر عامل، سچے پکے آدمی تھے اور جب حضرت شیخ عبدالقدوسؒ شاہ آباد سے گنگوہ تشریف لائے تو آپ نے اپنی روحانیت سے پہچان لیا کہ حضرت شیخ اعلیٰ درجے کے صوفی اور خداپرست روشن ضمیر صوفی اور بزرگ ہیں۔ باباہری داس نے حضرت کے علم وفضل اور کمال کے اعزاز میں اپنی کُٹی یا مکان ومقام حضرت کو سونپ دیا تھا اور حضرت شیخ آپ کی کٹی پر ہی مقیم ہوئے تھے بعد میں اسی مقام کا نام سرائے قطب عالم مشہورِ زمانہ ہوا۔

باباہری داس یہاں شہر میں قیام پذیر ہوئے کیونکہ گنگوہ کے آدھے حصے کو شہر کہا جاتا ہے مگر روزانہ شیخ کے یہاں ضرور جاتے تھے کیونکہ قاعدہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہم خیال، ہم مشرب، ہم زبان، ہم منصب کے پاس ہی اٹھتا بیٹھتا ہے۔ باباہری داسؒ ایک خدارسیدہ پہنچے ہوئے رِشی، صوفی، سنت اور کامل درویش تھے۔ آپ کے مجاہدات، عرفان، ایقان اعلیٰ درجے کے تھے۔ قدوسی مصاحبت قدوسی رشد وارشادات کے سبب آپ کی روح اور قلب

میں پاکیزگی، لطافت، نزاکت، شرافت، بالیدگی مزید سے مزید تر ہوتی گئی گویا آپ کے نام کے اثرات نے بھی آپ کے سراپا کو اپنے جلوؤں کے نور سے ڈھانپ لیا تھا آپ کا نام دو جملوں سے مل کر بنا ہے ''ہری'' اور ''داس'' یعنی خدا کا غلام، خدا کا داس — مشہور یوں ہے کہ آپ حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کے ہاتھ پر ایمان لے آئے تھے۔ آج بھی آپ کے ماننے والے بہت سے لوگ یوپی، ہریانہ اور پنجاب میں موجود ہیں جو خود کو ہری داسی کہتے ہیں یہ حضرات نماز، روزہ وغیرہ بخوبی بجالاتے ہیں۔ حضرت شیخ قریش احمد قدوسی گنگوہی کے مرید انبالے میں مستان شاہ اور ان کے اہل خاندان اور انبالے کے اردگرد میں ان کے چاہنے والے اس کی زندہ مثال ہیں۔ مگر چونکہ آپ نے کلمہ پڑھنے کے بعد اپنا نام نہیں بدلا تھا اس لیے ہندو انھیں ہندو خیال کرتے ہیں اور مسلمان انھیں مسلم سمجھتے ہیں۔ گنگوہ کے مشرق میں آپ کی سمادھی زیارتگاہِ خاص وعام ہے۔

ہر سال آپ کا میلہ لگتا ہے میلہ اس لیے کہا گیا کہ اس کا انتظام ہمارے ہندو بھائی کرتے ہیں اور عرس کی طرح اس میں قوالیاں وغیرہ نہیں ہوتیں اگرچہ اس میلے میں مسلمان بھی اسی طرح شریک ہوتے ہیں جس طرح اور دیگر حضرات شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان حضرات اپنے طور پر جب کسی مزار پر حاضر ہوتے ہیں تو حسبِ قاعدہ ایصالِ ثواب کرتے ہیں اور بابا ہری داس کی روح کو ثواب پہنچاتے ہیں۔ محترم ہری داس پورے گنگوہ میں اور اطراف میں بہت زیادہ شہرت رکھتے ہیں اور آپ کی کرامات بہت زیادہ مشہورِ خلق ہیں۔ کچھ لوگ یوں کہتے ہیں کہ حضرت شیخ عبدالقدوسؒ گنگوہی کے آنے کے بعد آپ گنگوہ میں رہے ہی نہیں بلکہ گنگوہ سے پانچ چھ کلومیٹر دور ایک موضع موہن پورہ عرف مین پورے میں چلے گئے تھے اور آپ کی سمادھی وہاں موجود ہے۔ بابا ہری داس کے ساتھ بالکل وہی معاملہ ہو رہا ہے جیسا کہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ پانی پتی کے ساتھ پیش آیا کہ آپ موضع بڈھا کھیڑا میں رہا کرتے تھے مگر پانی پت اور کرنال بھی آپ کے رہنے کے مقامات تھے۔ مرنے کے بعد بڈھا کھیڑے والوں نے بھی اپنے یہاں آپ کا مزار بنایا، کرنال والوں نے بھی آپ کا مزار بنایا اور پانی پت میں بھی آپ کا

لیکن سب کا غالب خیال یہ ہے کہ قلندر صاحب کا اصل مزار پانی پت میں ہی مزار ہے۔ اس طرح بابا ہری داس کا مزار بھی گنگوہ میں ہی ہے اور موضع مین پورے میں وہاں کے لوگوں نے عقیدت کے طور پر آپ کی سادھی اپنے یہاں بنالی ہے۔ بہرکیف آپ کا عرس یا میلہ الگ الگ تاریخوں پر گنگوہ اور موضع مین پورے میں منعقد کیا جاتا ہے۔ اور آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ بزرگ ہیں۔

قاضی فہیم الدین ایوبی

قاضی فہیم الدین ابن منشی قاضی اللہ دیا گنگوہ کے شیخ زادگان کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو فضل وکمال، مال ومنال، قیل وقال، جلال و جمال، دلیل ومثال، بے فکرو فارغ البال اور معززین زمانۂ حال لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ دن بھر کی مصروفیت سے نڈھال شام کے سکون پرور وقت میں شہر سے نزدیک ایک کھیت کے قریب ان لوگوں کی ایک نشست ہوتی تھی۔ اس جگہ کے اردگرد انار کے پیڑ اور پھلواری لگائی گئی تھی۔ اس کی صفائی اور دیکھ بھال کے لیے نوکر موجود تھے عام طور سے یہ مقام گڑھی کا کنواں مشہور تھا۔ موجودہ ہیروز میموریل ہائی اسکول کے پیچھے یہ مقام تھا اور اس کے کھنڈر ایک بھولی بسری داستان کی طرح میں نے اپنے بچپن میں دیکھے تھے۔ ہر روز شام کے وقت یہاں خوش فعلیوں میں مصروف، ذہنی آسودگی حاصل کی جاتی تھی ان محفلوں کی جان اور روحِ رواں جن کے بغیر یہ مجلسیں بے رونق اور پھیکی رہتی تھیں۔ وہ ذاتِ مکرم تھی جس کو قاضی فہیم الدین ایوبی کہتے ہیں۔ یہ ایک زمیندار گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی اور راقم الحروف نسیم انور ایوبی کے والد قاضی فخر الدین کے برادرِ کلاں تھے۔ کھیت کھلیان اور کاروبار کی دیکھ بھال میرے والد کرتے تھے اور میرے تائے قاضی فہیم الدین ہمہ دم فارغ رہتے تھے آپ میں عالی ظرفی، شرافتِ علمی، نجابتِ نسبی، وجاہتِ جسمی، وقارِ معنوی وصوری، صلاحیتِ ذہنی، نقطہ رسی، بذلہ سنجی، فطرت مزاحی، خوش ذوقی، خوش سلیقگی، فراستِ موضوعی، فارغ ذہنی بدرجہ اتم موجود تھی۔ ظرافت ولطافت نظافت کے ساتھ ساتھ قابلیتِ وہبی سے سرفراز تھے۔ نہایت

تیز طرار فعّال شخص تھے۔ محفلوں کو زعفران زار بنائے رکھنے اور سنجیدہ و مسکوت کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ یہ پُر محبت نفاق سے دور اہل دل، دانش ور، غریب پرور، انسان نواز لوگ آج کہاں، کاش ہم میں سے کوئی ان کا مقلد بن کر منظر عام پر آجائے۔

لالہ رام سروپ

لالہ رام سروپ بزرگانہ شرافت کے امین، انسانیت کے ہمدرد، مخلص، خوش اخلاق، باہمی میل و محبت کے مرکز اور قصبے کے نیک انسان تھے۔ ۱۹۵۰ء کے قریب میرے بچپن میں لالہ جی اِن چند معزز حضرات میں سے ایک تھے جنھیں بلا مبالغہ قصبے کی آن وشان کہا جانا مناسب تھا اپنے دور کے اچھی سیاست کے کامیاب سیاست داں تھے۔ اس زمانے میں آج کی مفاد پرست تاجرانہ سیاست نہیں تھی۔ بلکہ اس دور کی اصل سیاست تو یہ تھی کہ قصبے کے لیے فلاحی کام زیادہ سے زیادہ کیے جائیں۔ لوگوں کی مشکلات کو اوّلین فرصت میں آسان بنائی جائیں۔ اگر صاحب اقتدار کام صحیح نہیں کر رہا ہے تو اس کو ہٹا دیا جائے۔ یہی اس دور کی سیاست تھی۔ زیادہ تر ممبران کا انتخاب ان کی اچھائیوں کی بنا پر بلا مقابلہ کرلیا جاتا تھا۔ میں نے ان محترم کا زمانہ نہیں دیکھا مگر ان کے بارے میں سنا ہے کہ ان کی چیئرمینی کا دور بہت اچھا تھا۔ مخالفین بھی ان کی نیک نیتی کے قائل تھے۔

لالہ کیدار ناتھ

میں نے اپنی کم سنی میں انھیں دیکھا ہے۔ خوبصورت چہرہ ہنسی بولتی آنکھیں، شفقت و محبت کی آئینہ دار تھیں۔ اپنی نشست گاہ میں باوقار انداز میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ اکثر بڑے بوڑھوں سے سنا ہے کہ یہ لوگ ہندو مسلم کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔ بلکہ یہ حضرات تو انسانیت کے حامی، محبت کے پیامی، اتحاد کے پجاری تھے۔ بزرگوں کی صحبتوں نے ان کے دل و دماغ کو کندن بنا دیا تھا۔ ان میں کھوٹ کپٹ نام کو نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی قوت وطاقت، مال و دولت علمی اور فلاحی کاموں میں صرف کر کے رہتی دنیا تک اپنا نام زندہ

وسلامت کرلیا ہے۔ میرے علم میں بچپن سے ہی یہ بات آئی ہوئی ہے کہ ایچ. آر. انٹر کالج کو پچاسوں بیگھے اراضی لالہ کیدار ناتھ کی ہی عطا کی ہوئی ہے۔

لالہ مہاراج سنگھ

لالہ مہاراج سنگھ قصبے کے تعلیم یافتہ اور امیروں میں سے تھے۔ ان کے دل میں اہل قصبہ کی بہت زیادہ وقعت تھی اور وہ خالص تعلیمی ذہن و دماغ کے آدمی تھے۔ ان کے زمانے میں گنگوہ کی آبادی نہ صرف کم تھی بلکہ پانچویں کلاس تک پڑھنے والے بھی کم ہی ہوا کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے دل میں کروٹیں لیتی ہوئی علمی آرزو کی یوں تکمیل کی کہ گنگوہ سے دور شہر سہارنپور میں خاص اپنے صرفے سے ''مہاراج سنگھ ڈگری کالج'' قائم کیا اور گورنمنٹ سے منظوری کرائی۔ یہ کالج سہارن پور کے مشہور اور مقتدر کالجوں میں مانا جاتا ہے۔ اس کالج کا پرنسپل آج بھی اسی خاندان کا ہوتا ہے۔ اس قصبے کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تعلیمی بیداری اور علمی شعور روزِ اوّل سے ہی پایا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں کا نام رہتی دنیا تک رہتا ہے جو لوگ اچھی باتوں کی ابتدا کرتے ہیں۔ اہل گنگوہ محترم مہاراج سنگھ کے مشکور ہیں کہ انھوں نے علم کی شمع روشن کی۔

الحاج حافظ حکیم شفیق احمد قدوسیؒ

ایک بڑا آدمی، چھوٹے کے گھر

غالباً ۱۹۷۵ء کا ذکر ہے کہ کسی خاص وجہ کی بنا پر میں نے سلسلۂ درس و تدریس چھوڑ کر سائیکل مرمت کی دوکان کر لی تھی۔ یہ دوکان لبِ سڑک تھی اس وجہ سے ٹریفک کی زیادتی سے دھول اڑتی رہتی تھی۔ کپڑوں اور پورے سراپا کا بُرا حال رہتا تھا۔ ویسے بھی سائیکل مرمت کا کام دھول مٹی کا ہی ہے۔ اس پر طُرہ یہ کہ گریس اور پُرزوں کے میل سے ہاتھ اور کپڑے سیاہ ہو جاتے ہیں کام کی زیادتی کی وجہ سے جسم تھکن سے چور تھا اور مزید کام پڑا ہوا تھا۔ ایسے عالم میں السلام علیکم کی شیریں آواز سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک

خوبصورت اور بھولا بھالا چہرہ نظروں کے سامنے موجود تھا۔ میں نے حیرت بھرے لہجہ میں کہا۔ حکیم صاحب آپ اور یہاں۔ مجھے بلوالیا ہوتا۔ اور میں نے اُن کو کرسی پیش کی تو آپ نے فرمایا۔ ایوبی صاحب! چونکہ ضرورت میری تھی اس لیے خود مجھے ہی آنا ضروری تھا۔۔۔!! حکیم صاحب! آمد کا سبب بتلاتے رہے اور میں ایسے معزز کو یہاں موجود پاکر شرمندہ ہوتا رہا دراصل یہاں حکیم صاحب کے بارہ میں کچھ لکھنا یا آپ کا تعارف نہیں کرانا بلکہ میں حکیم صاحب کے سادہ طرز و انداز، عالمانہ وشائستہ گفتگو اور بزرگانہ شفقت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس دن کا وہ لمحہ دل و دماغ اور آنکھوں میں بس کر رہ گیا۔ یہ چند سطور اسی تاثر کا نتیجہ ہیں۔ حکیم صاحب صاحب کردار، اعلیٰ اخلاق کے حامل طرز اسلاف پر چلنے والے بزرگ تھے۔۔۔۔۔ میں حکیم صاحب کو معالج کی حیثیت سے جانتا ضرور تھا مگر کبھی براہِ راست آج کی طرح شرف ملاقات حاصل نہیں ہوا تھا۔ آپ کا نام گرامی شفیق احمد ہے۔ گنگوہ کے مشہور اور حاذق حکیم شریف احمد قدوسی کے یہاں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گنگوہ میں ہی حاصل کی مگر ''عالم'' کی سند دارالعلوم دیوبند سے لی۔ طب وحکمت کی تعلیم دہلی طیبہ کالج قرول باغ دہلی میں ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں تکمیل الطب کی سند مرحمت ہوئی اور ۱۱رجون ۲۰۰۱ء میں بعمر ستاسی سال وفات پائی اور اپنے مکان کے برابر میں قدوسی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

حکیم شفیق احمد قدوسی اپنے وقت کے مشہور و حاذق معالج خوش اخلاق وخوش وخرم عالم دین، متدین، متشرع، پابند صوم وصلوٰۃ فرد تھے۔ خوش الحان، پختہ حافظ وقاری تھے۔ غالباً تیس پینتیس سال متواتر درگاہ قطب العالم کی مسجد میں قرآن پاک تراویح میں پڑھا۔ آپ کو کلام پاک بہت اچھا یاد تھا۔ ترتیل وقرآت کے ساتھ خوش کلامی کے ساتھ پڑھنے کا شوق تھا۔ کلام الٰہی سے دلی لگاؤ اور روحی شغف تھا اس لیے رمضان المبارک میں آپ کے پیچھے قرآن پاک سننے والوں کا بڑا مجمع ہوتا تھا۔ آپ کے مطب میں روزانہ سینکڑوں مریض آتے تھے جن سے نرم روی، خوش دلی اور متانت سے گفتگو فرماتے تھے۔ نہایت نکتہ رس، بزلہ سنج، حاضر جواب، خوش گفتار فرد تھے۔ لطیف طنز ومزاح کی وجہ سے مخاطب اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ بڑی مستند ومعتبر شخصیت تھی، متشرع دیندار حد درجہ غیور انسان تھے۔ بزرگانہ

شفقت اور وضعداری کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ شرافت خاندانی، حمیت انسانی اور محبتِ اسلامی میں آپ کا جواب نہ تھا۔ کردار سازی، ادب و آداب، خودداری، احکام ربانی کی پاسداری، اکل حلال، صدق مقال، صدق وصفا کی سب کو ہدایت وتبلیغ کرتے رہتے تھے، ہر خورد وکلاں سے بزرگانہ شفقت ومحبت سے ملتے تھے۔ پیرانہ سالی میں بھی اپنے روزمرہ کے کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے کے عادی تھے۔ اپنے روزانہ کے اوراد وظائف ان کے صحیح وقت پر ادا کرنے کے عادی تھے۔ اور دوسروں کو بھی معمولات کی ادائیگی ان کے اصل وقتوں پر ادا کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ ڈاکٹر محمود رشید ڈاکٹر یوسف رشید ڈاکٹر عارف رشید ڈاکٹر مسعود رشید، آپ کے اخلاف ہیں۔ امید کہ یہ بھی آپ کے مقلد ثابت ہوں گے۔

صوفی حمید احمد عابد

صوفی حمید احمد عابدؔ سلف الصالحین قرنِ اولیٰ کے جلیل القدر مسلمانوں میں شمار ہونے کے قابل تھے۔ مہذب ونرم گفتار، بزرگانہ اوصاف کے حامل شخص تھے۔ جب ہم عصروں سے ہمکلام ہوتے تھے تو شگفتہ مزاجی، لطافت وعلمیت، قابلیت، ذاتی صلاحیت کے جملہ لوازمات دورانِ گفتگو رونما ہوتے تھے۔ چھوٹوں سے گفتگو میں شفقت، لطف وعطا، عنایت، بخشش، عمدگی اور بزرگانہ خوش خلقی، خوش کلامی اپنے پورے عروج پر ہوتی تھی۔ ان کی سعی یہ ہوتی تھی کہ مخاطب چونکہ خورد ہے اس لیے اس کو سلف کے کارنامے، طور طریقے، اقوال واعمال اور آثار سے واقف کرادوں۔ لیکن اندازِ بیان دل نشیں اور عام فہم ہوتا تھا۔

گنگوہ کی سیاست اور قصبے کی فلاح وبہودگی میں ہمہ حال براہِ راست دخیل رہے۔ آپ کے نظریات، قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ نہایت ادب پرست، ادب نواز اور مشاعرہ نواز فرد تھے۔ خود بھی شاعر تھے اور اپنے گھر مشاعرہ کر کے شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ اعلیٰ اخلاق انسان تھے۔

بابولطیف احمد

محترم ڈاکٹر اللہ بندہ کے فرزند تھے۔ ڈاکٹر صاحب کوان کی قابلیت پر گورنمنٹ برطانیہ نے وکٹوریہ کراس اعزاز سے نوازا تھا۔ اس زمانے میں یہ اعزاز کسی ہندوستانی کے لیے لائق فخر وعظمت سمجھا جاتا تھا۔ بابولطیف نہایت تعلیم یافتہ، باصلاحیت، اعلیٰ صلاحیت کے حامل انسان تھے۔ انگریزی فوج میں بڑے عہدے پر فائز تھے۔ گنگوہ میں قاضی پارٹی سے ہمیشہ متعلق رہے۔ اور میونسپلٹی کے تاحیات ممبر رہے۔ بابولطیف میں اسلاف کی شرافت وضعداری، لحاظ داری، دینداری اور رواداری پوری پوری موجود تھی۔ گنگوہ والوں کے لیے محترم رہے اور آپ کی زندگی ایک مصفی آئینہ کی طرح تھی۔ ہردم ہر حال میں خوش وخنداں ہر فرد وبشر کے لیے فراخ دل وکشادہ دامن تھے۔ کاش ہم ایسے لوگوں کے مقلد بن جائیں۔

بابو وجیندر کمار

بابو وجیندر کمار کا خیال آتے ہی ایک معمولی تن وتوش غیر قدآور شخص کا سراپا آنکھوں میں بس جاتا ہے۔ جس کے چھوٹے سے سر میں اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا دماغ رکھ دیا تھا۔ ایک چھوٹے قد کا بڑا آدمی اور بلند شخصیت کا مالک فرد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے امیری کے ساتھ اس کے چھوٹے سے سینے کو عظیم دل عطا کیا تھا اس لیے اس کی نشست گاہ کی بزم آرائی کی رونق کبھی کم نہ ہوتی تھی اسے مذہبوں کے بھید بھاؤ سے کوئی مطلب نہ تھا وہ تو انسانیت اور اخلاق واخلاص کا پجاری تھا اگر اس کی ذات کو خلوص، ہمدردی، غریب پروری، خدمت خلق، ادب نوازی، علم شناسی، انسان دوستی، حب قومی، وطن پرستی، خیر خواہی کی نرم وگداز آغوش قرار دے دیا جائے تو بجا ہے۔ کئی غریب بچے اس کی بروقت مالی امداد کی بنا پر آج بہت اچھے انجینئر ہیں۔ وہ انصاف پسند فرد تھا پانچ بھائیوں کا ایک قضیہ زمین کی ملکیت سے متعلق دونوں حضرات نے اس کے سپرد کردیا تھا...تو...اس نے انصاف سے کام لیا اور حق بحق داد رسید والا معاملہ کیا۔ غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرکے انصاف پسندی سے کام لیا جو اس کے

منصف دل و دماغ کی روشن دلیل ہے۔
قیافہ شناسی اور انسان فہمی اس کی فطرت میں بطورِ خاص موجود تھی۔ معاملات نہایت صاف اور شستہ، گفتگو مہذب اور سنجیدہ کردار اعلیٰ، اخلاق مخلصانہ، انداز والہانہ اور دوستانہ وہ مساوات کا علم بردار تھا۔ ہر سال رمضان المبارک میں افطار پارٹی منعقد کرنا اور ایک روزہ رکھنا اس کی عادت بن چکی تھی اور یہ افطار پارٹی اس کے خلوص پاکیزگی انسان دوستی مساوات اور مہمان نوازی کی وجہ سے دور دور مشہور ہوگئی تھی۔ وہ ہمہ وقت سب کے لیے اپنی باہیں کھولے رکھتا تھا اور اپنے دامن کو کشادہ کیے رکھتا تھا مگر یہ نیک شخص ہمہ صفت آدمی جلد ہی داغِ مفارقت دے گیا۔ اور اپنی اچھی یادیں اور بہتر سیرت کے واقعات لوگوں کے ذہنوں پر حاوی کر گیا۔

چودھری شریف احمد

شگفتہ دل کی طرح شگفتہ رو، روشن سنجیدہ آنکھیں جن میں خوش آمدید کی کیفیت جھلکتی تھی، معمولی تن و توش والی لائق عزت اسم بامسمّیٰ شریف شخصیت تھی جو ہمیشہ اپنے قصبے اور ملک کے خیر خواہ رہے ہیں۔ بابو لطیف احمد کے معتمد خاص تھے۔ اُن کی اراضی پر آپ ہی کاشت کرتے تھے اور نہایت ہی ایماندار تھے۔ گنگوہ کی سیاست میں قاضی پارٹی میں رہ کر با کردار، باعزت اور فعال شخص مشہور رہے ہیں۔ لال مسجد کے مدتوں منتظم رہے اور تادمِ آخر اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ مسجد کے کام کرتے رہے۔ قدیم طرز کے بنے ہوئے مکانات نئے انداز کے بنائے اس طرح زمین بھی بچی اور عمارت بھی اچھی لگنے لگی۔ نہایت سادہ دل، دیندار، مخلص، یادگار انسان تھے۔ ایسے لوگ اب کم ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی یادگاریں باقی ہیں۔ اگر آئندہ بھی آنے والی نسلیں باقی رکھ سکیں تو بہتر ہو۔

پریم چند گوئیل

انچ. آر. انٹر کالج کے سب سے پہلے پرنسل ہیں۔ گویا اس وقت گنگوہ کے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے پریم چند گوئیل اول نمبر پر تھے اور یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ کیوں کہ ایک انٹر کالج کی ہر طرح کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آگئی تھی اور یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ کسی کالج کا انتظام سنبھالنا ایسا ہی ہے جیسے کسی ملک کے ایک صوبے کا انتظام۔ گوئیل صاحب نے اس کام کو اس طرح انجام دیا کہ اس کا حق ادا ہو گیا۔ پریم چند گوئیل کالج کے روح رواں بن گئے۔ یا یوں کہیے کہ اس نے خود کو گم کر دیا چونکہ یہ کالج بالکل نیا تھا اس کے ہر شعبے کو مکمل اور تا دیر قائم رہنے والا بنانا تھا۔ اس لیے گوئیل صاحب اس کے کام میں بالکل کھو گئے۔ اور اس کی جڑیں اتنی مضبوط کر دی کہ گرائے سے نہ گریں۔ اصل میں یہ سب کچھ مردانہ ہمت، ذاتی صلاحیت، علمیت، صبر و تحمل، سنجیدہ روی، اصول پسندی اور غیر معمولی ثابت قدمی کا نتیجہ ہے۔ گوئیل صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کالج کو ملک کے اچھے کالجوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

الحاج محمد اختر گنگوہی مقیم حال خریجی دہلی

حاجی محمد اختر ماسٹر اللہ دیا صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ آج سے پچاس پچپن سال پہلے محلّہ محمد غوری گنگوہ میں ماسٹر اللہ دیا صاحب اپنی برادری کے امیر ترین فرد تھے اور انھوں نے اپنے محلے میں وہ جائدادیں خریدیں کہ آج ان املاک میں سے ایک ایک حصے کی قیمت کروڑوں روپے ہیں۔ ماسٹر صاحب کے انتقال کے بعد تمام املاک تینوں بیٹوں میں تقسیم ہوئی۔ مگر تینوں بھائی اپنی ناتجربے کاری اور کم عمری کی وجہ سے اپنی اپنی ملکیتوں کو باقی نہ رکھ سکے اور صرف آبائی مکان بچا پائے۔ پھر دنیا کے دستور کے مطابق تینوں نے اپنا اپنا کام علیحدہ علیحدہ کر لیا اختر بھائی نے حالات کی تلخ کامی اور غم روزگار کی وجہ سے دہلی کو مرکز و مقام بنا لیا۔ اختر بھائی بچپن سے ہی آرٹ اور ڈیزائن میں شوق و ذوق رکھتے تھے۔ خوش خطی میں بھی اچھی مہارت تھی۔ مذہبی امور کی انجام دہی ابتدائے عمر سے ہی

موجود تھی۔ دہلی آنے کے بعد مشکلوں، دقتوں، پریشانیوں اور مصیبتوں کے دور سے اسی آرٹ اور ڈیزائن کے ذریعے آسانیوں کی طرف تیزی کے ساتھ رواں دواں ہوئے اور ایکسپورٹ کی دنیا میں اب آپ سب سے مشہور سب سے بڑے فیشن ڈیزائنر قرار پائے۔

اختر بھائی نے اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کے لیے چوبیس گھنٹے بامقصد جدوجہد جاری رکھی ہے اور ٹوٹتے بکھرتے مایوسانہ لمحوں میں عزم ویقین اور ثابت قدمی اپنا نصب العین بنائے رکھا۔ اسی نصب العین، عمل پیہم اور یقین کامل کا نتیجہ ہے کہ آج آپ امارت کی دنیا میں ایک بلند مقام کے حامل ہیں۔ دینی اور فلاحی کاموں میں آپ کتنے منسلک ہیں یہ شمار مشکل ہے۔ نادار لڑکیوں کی شادیاں کرانا، اپنے خرچ سے مدرسے قائم کرانا، کئی مدرسوں کا خرچ برداشت کرنا، مسجدوں میں زیادہ سے زیادہ روپیہ لگانا، بلکہ مسجدیں بنانا آپ کا شعارِ اسلامی ہے۔ ان سب کے باوجود طور طریقے، لباس وغیرہ نہایت سادہ اور بالکل دیہی طرز وانداز کا شریفانہ ہے۔

قاضی منصور حسرتؔ گنگوہی

گنگوہ کا علامہ اقبال

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یہ مصرعہ شاعر نے کس سیاق وسباق کے ساتھ کہا کس ماحول میں اور اس کے مخاطب کون لوگ تھے یہ تو ایک الگ بات ہے مگر گنگوہ کی مٹی کو نم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں کی زمین تو از خود ہی زرخیز ہے۔ یہاں سے ہر دور میں اہل علم وفضل یکتائے زمانہ اٹھتے رہتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہی نہیں بلکہ دنیا میں مشہور ومعروف ہیں اور جن کے ذکر واذکار پر ضخیم کتابیں موجود ہیں۔ یہاں ان سب کا احاطہ کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف قاضی منصور احمد حسرتؔ پر چند سطور تحریر کرنا دلی منشاء ہے دراصل کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو دوسرے انسان کو ایک بار ملنے پر ہی متاثر کر دیتی ہیں قاضی منصور احمد حسرتؔ بھی ایسی ہی باکمال شخصیتوں میں سے ایک ہے۔ گنگوہ ہر طور سے علم وفن، شعر وادب، فہم وسخن وملّی ودینی فراست وبصیرت کا بڑا مرکز رہا ہے، روز

روز شعر وسخن کی محفلیں، علمی، دینی، اسلامی، ملکی، سیاسی اور سماجی معاملات پر تبادلۂ خیالات کی سرگرمی کے ساتھ بزم آرائی رہی ہے۔ یہاں پندرہ روزہ اور ماہنامہ مشاعروں کا عروج رہا ہے۔ گویا یہ علمی وادبی مذاکرے اچھے انسان اور بہتر شاعر بنانے کے ایک طرح سے مرکز تھے۔ ۱۹۵۸ء تک یہاں یہ علمی فضا قائم رہی کیونکہ اس وقت تک یہاں چند بزرگ نفوس اگلی شرافت وبصیرت کو قائم رکھے ہوئے تھے، اسلاف کے مقلد، نئے دور میں اسلامی اور قومی شعار کو نئے انداز میں شعروسخن کے ذریعے پیش کرنے والوں میں حسرت گنگوہی ایک پُرکشش دلآویز نام تھا جو اپنے اچھوتے اسلوب، منفرد طرز شاعری سے قاری کے دل میں جگہ بنا رہا تھا۔ دردِ قومی وملی، مساوات ومحبت، اخوت اسلامی، فراست مومن، عزم محکم، یقین کامل، جواں ہمتی، جوشِ ایمانی، بصیرت مسلمانی، عمل پیہم، ایمان وایقان اسباب زوال قوم، عروج ملی ودینی، حصول کامرانی، دعوت کتاب وسنت اس کی شاعری کے عنوانات ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ سلیس وشگفتہ انداز بیان، زبان نہایت سادہ صاف، برمحل الفاظ کا چناؤ مناسب طور پر حسرت کی علمی صلاحیت کا ثبوت ہے۔ خشک مضمون ہونے کے باوجود بھی شعریت وبلاغت معنوی وصوری موجود ہے جو دل کی گہرائیوں کو چھو لیتی ہے۔ اور یہی اوصاف اُس کو دوسروں سے منفرد وممتاز بنا کر اقلیم سخن میں اعلیٰ منصب عطا کرتے ہیں۔

حسرت کی شاعری پورے لوازمات شاعری کے ساتھ آراستہ ہے۔ زبان وبیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ فکروخیال کی پاکیزگی کی حسیت میں ایک نئے پن کا احساس وادراک اشعار میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ حسرت گنگوہی کا شعری سفر نصف صدی سے زیادہ وقت سے تاحال تسلسل کے ساتھ شعری انہماک میں آگے بڑھ رہا ہے مگر نئے زمانے کے نئے محسوسات، نئے مسائل، نئے مشاہدات کو نئے اور نمایاں جدید اسلامی وقومی لباس میں ملبوس کر کے شاعری کی زبان میں فنی چابک دستی کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اگر حسرت گنگوہی کی شاعری کو بلند معیاری، حقیقی، قومی، اسلامی اور مجاہدانہ شاعری کہہ دیا جائے تو بجا ہے — اگر کبھی نقادان فن نے حسرت کی شاعری پر غور وفکر اور تحقیق فرمائی تو واضح ہو جائے گا کہ اس کی شعری تخلیقات یقیناً گنگوہ کے علامہ اقبال کی تخلیقات ہیں۔

انعام الحق بسمل گنگوہی

افق گنگوہ کا تابناک سورج جو بہت جلد گہنا گیا

گنگوہ کے شاعروں کی طویل فہرست میں یوں تو کئی اہم، مقتدر اور بزرگ نام موجود ہیں مگر بسمل گنگوہی یہاں کے تمام شاعروں سے بالکل مختلف، منفرد اور ممتاز لب ولہجہ کا اسلامی و قومی شاعری کا قدآور طاقتور علمبردار ہے۔ علم وادب، شعر وسخن اور فضل وتدبر میں یکتا بسمل گنگوہی یہاں کی فضا پر چھایا ہوا تھا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک مشاعروں اور عام وخاص محفلوں کا مقبول ومنفرد شاعر اگر کوئی تھا تو وہ صرف بسمل ہی تھا۔ زمیندار گھرانے کا پروردہ پٹواری عبدالسمیع کا نورِ نظر مروجہ تعلیم کی فراغت کے بعد یہیں گھر پر ہی مقیم رہا۔ مزید تعلیم کے لیے کہیں باہر جانے کا اس لیے قصد نہیں کیا کہ زمین، جائداد، روپیہ، پیسہ بہت تھا گزر بسر ناز ونعم کے ساتھ ہو رہی تھی، لہٰذا فارغ وقتی کے لیے فنونِ لطیفہ بطور شغل جاذب توجہ رہا۔ اسی دوران تاریخ اسلاف، تاریخ اسلام اور تاریخ بلدان کے مطالعہ کی طرف خاندانی واسلامی ماحول نے رغبت دلائی۔ چنانچہ بسمل کی شاعری رزم وبزم اسلامی کا مرقع بن گئی۔ لہٰذا بسمل کا نام گنگوہ اور اس کے اطراف میں اسلامی شاعر کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہو گیا۔ گویا انعام الحق کی شاعری تاریخ اسلامی کے دورِ اول کی سپاہیانہ اور مجاہدانہ جوش وولولہ، قوتِ ایمانی، اور حق وباطل کی معرکہ آرائی کی پُرزیب دلکش داستان معلوم ہوتی ہے۔ اس کی شاعری اُس نوجوان مسلم سپہ سالار کی کارگزاری ہے جس کے توانا اور طاقتور ہاتھوں میں دھاردار اور چمکدار تلوار ہے جو باطل کو یکسر کاٹ دینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے جس کا دل نورِ ایمان سے منور بھی ہے اور اور باحوصلہ بھی اور وہ جنگ کے میدان میں اپنی دلیری کے جوہر دکھانے کے لیے بےقرار بھی ہے۔ اس کو زبان وبیان پر پورا عبور حاصل ہے۔ قطرہ کو دریا کر دکھانے کا گُر اس کو بخوبی آتا ہے۔ ذہین وتیز طرار، پُرجوش صاحب طرز شاعر ہے، مناسب وموزوں الفاظ کا اشعار میں استعمال اس کی فنی پختگی کی دلیل ہے۔ زود گو ہے۔ اس کی زبان میں جادو ہے جو قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ حافظہ نہایت قوی ہے۔ کئی کئی غزلیں اور طویل طویل نظمیں بلا تکان روانی کے ساتھ زبانی سنا دیتا ہے۔ اس کی شاعری

پُر جوش، ولولہ انگیز انفرادی اور اسلامی وقومی شاعری ہے۔ دس پندرہ سال تک گنگوہ اور اطراف واکناف گنگوہ میں بسملؔ کا طوطی بولتا رہا مگر اس کے ہم عصر شعراء میں سے کئی اس کے حریف وعدو بن گئے اور اس کی شہرت ومقبولیت ان سے دیکھی نہ گئی اور مختلف ہتھکنڈوں سے اس کو برباد کرنے کی سازشیں ہونے لگیں آخر کار یہ ہونہار شاعر مقامی ہم عصر رقابت وعداوت کی نذر ہوکر رہ گیا۔ اور مایوس ومغلوب ہوکر افق شاعری سے معدوم ہوکر رہ گیا۔ اور اس کا تمام سرمایۂ شاعری بھی بے پروائی، مایوسی اور دل شکنی کے اندھیروں میں روپوش ہوکر رہ گیا۔

بسملؔ عجائب روزگار شعراء میں سے ایک تھا، اس کی تمام شاعرانہ کاوشیں علامہ اقبال کے طرز وانداز پر تھیں۔ گنگوہ میں یہ اقبال کا مقلد آج بھی زندہ ہے اور اپنی پیرانہ سالی کا زمانہ تنہا بے کسی کی حالت میں گزار رہا ہے۔ دراصل معلوم یہ ہوا کہ یہ شخص حریفوں کے درمیان تنہا رہ گیا تھا۔ سادہ لوح انسان تھا اور دوسرے نہایت چالاک، مزید برآں یہ کہ اسی دوران والدین کی وفات کا صدمہ اور بڑے بھائی کے پاکستان چلے جانے کا غم اس کے سر پر حاوی تھا۔ اُدھر کوئی روزگار نہ اپنانے سے پہلے نقد رقم ختم ہوئی پھر رفتہ رفتہ زمین جائداد اور گھر فروخت ہوا تو یہ ہر طرح سے مجبور و مایوس ہوکر میدان زندگی سے فراری پر آمادہ ہوکر گوشۂ گمنامی میں کھو گیا۔

لالہ کانتا پرشاد

لالہ کانتا پرشاد سنجیدہ، خاموش طبع، خوش فکر، متین، خوش اخلاق انسان تھے۔ گنگوہ کی سیاست میں بڑا دخل رہا ہے۔ قصبے کی خوشحالی وترقی کی طرف آپ کا بڑا رجحان تھا۔ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر میونسپل بورڈ کی ممبری آپ کو حاصل رہی ہے۔ آپ ہمیشہ قاضی مسعود احمد کی پارٹی اور ان کے نظریات سے متفق رہے ہیں۔ آپ کا پورا خاندان بلکہ آپ کا پورا محلہ آپ کے شانہ بشانہ چلا ہے۔ گنگوہ کے نامور تاجر اور کامیاب سیاستداں تھے۔

لالہ اوم پرکاش گھوڑے والے

اپنے دور کے اچھے تاجروں میں شمار ہوتے تھے۔ تجارت کی کامیابی کے ساتھ ساتھ قصبے کی سیاست میں دلچسپی رہی ہے۔ آپ نے بھی قاضی مسعود کی صحبتوں اور اپنے مفاد کے طفیل میونسپل بورڈ کی ممبری حاصل کی۔ جوڑ توڑ کی سیاست میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار آپ چیئرمین بھی رہے۔ مگر جوڑ توڑ کی سیاست میں موڑ آتے رہتے ہیں اور انسان جہاں سے چلتا ہے وہیں آکر ٹھہر جاتا ہے۔ بہرحال آپ گنگوہ کی سیاست میں کافی مشہور رہے ہیں۔

لالہ پون کمار

لالہ پون کمار اپنے والد کی طرح قابل قدر مخلصین حضرات میں سے ہیں۔ آپ کا رہن سہن بڑا پاکیزہ اور صاف و شفاف آئینے کی طرح ہے۔ ملکی اور مقامی سیاست سے ہمیشہ کنارہ کشی رہی ہے۔ مساوات اور محبت باہمی کے پرستار ہیں اپنوں اور بے گانوں سے خوش خلقی، خوش دلی اور گرم جوشی کے ساتھ ملتے ہیں۔ آپ کی بیٹھک اچھے لوگوں کے لیے ہمیشہ کھلی رہتی ہے۔ کردار اعلیٰ، گفتگو مہذب، چہرہ متین، طبیعت میں سادگی اور سنجیدگی ہے۔ ابھی آپ کی معقول شخصیت ہمارے درمیان ایک آئینے کی طرح موجود ہے، خدا کرے تادیر قائم و دائم رہے۔

قاضی راشد مسعود، چیئرمین گنگوہ

ایک شہنشاہ مگر فطرتاً درویش

چند ہڈیوں پر مشتمل پتلا، دُبلا، درمیانہ قد، روشن آنکھیں، ہنستا چہرہ، غریب پرور، انصاف پسند، گوراچٹا خوبصورت، خوش پوشاک، خوش اخلاق، بےلوث، بے باک شخصیت کا نام قاضی راشد مسعود تھا۔ خدا معلوم اِس نام میں کیا چیز پوشیدہ تھی کہ اس سے اچھے اچھوں

کے پتے پانی ہوجاتے تھے۔ غالباً لوگ اس سے اس لیے مرعوب تھے کہ صاف گو، زندہ دل، اعلیٰ دماغ، نیک مزاج، نیک روح، بے لوث، سچا پکا مسلمان لیڈر تھا۔ نہ جانے میرے جیسے کتنوں کا والی ووارث تھا۔ اہل نظر، دانشور، خداپرست، خداترس، خداشناس، خدا آگاہ، مخلص انسان تھا۔ حالانکہ جواں عمری میں مرگیا۔ مگر اس کے مرنے سے نہ جانے کتنوں کی سیاسی، سماجی، اصلاحی، تعلیمی اور تدریسی موت واقع ہوگئی ہے۔ وہ گنگوہ کا چیئر مین، نیتا، اور لیڈر نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو گنگوہ والوں کا مسیحا تھا۔ مدعا تھا، مداوا تھا، والی تھا، پیر گنگوہ تھا، وہ تھا تو آدمی ہی مگر شاید وہ کوئی فرشتہ تھا، وہ اہل گنگوہ کے لیے نہ جانے کیا کیا تھا۔ دراصل آدمی کو جب تک اس کے قریب رہ کر پرکھا نہ جائے، بخوبی برتا نہ جائے تو پتہ نہیں چل پاتا کہ اصل میں وہ ہے کیا؟ کیونکہ ظاہر و باطن یکساں نہیں ہوتا۔ جب آدمی سے واسطہ اور معاملہ پڑتا ہے تو اس کی خوبیاں اور خامیاں تب ہی منظر عام پر آپاتی ہیں۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۱ء تک میرا، اُس کے پاس بہت زیادہ اٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔ مجھے اُس کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوسکا۔ اس کی شخصیت صاف وشفاف کورا کاغذ تھا۔ جس پر نہ کوئی حرفِ تصنع تھا نہ کوئی داغ کبر و تکبر وہ جنگ جو بھی نہیں تھا بلکہ صلح کُل اور مساوات کی مسند پر دل میں محبت لیے بیٹھا تھا راشد مسعود باشعور و باکمال حقیقت شناس انسان تھا۔ اسی لیے نمبر دار قاضی مسعود احمد نے اپنی حیات میں ہی سیاسی مسند اس کے سپرد کردی تھی۔ اور اس نے بھی والد کی طرح یہاں کے حالات و معاملات کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ بزرگوں کی عظمت کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ مزید وقار بخشا ہے۔ قاضی محمد حنیف کے دور سے لے کر سرکاری اہلکار و افسران جب بھی بیٹھک پر آئے تو خادمانہ آئے ہیں۔ حاکمانہ انداز دکھانے کی کسی کو ہمت نہ ہوسکی راشد کی فطرت میں سماجی، سیاسی، انتظامی فراست وصلاحیت قدرت نے بطور خصوصی رکھی تھی۔ رشید مسعود ایم پی سابق ہیلتھ منسٹر کو آل انڈیا معیار کا لیڈر بننے میں راشد مسعود کی فراست کا زبردست عمل ودخل رہا ہے۔ بے قابو حالات کو ہموار کرنے، ذہنوں کو پرکھنے اور قابو میں رکھنے کا فن اس کو خوب خوب آتا تھا۔ امارت کے باوجود درویش صفت بااخلاق مخلص آدمی تھا۔ اقتدار وافتخار کے ہوتے ہوئے بھی سادہ روی اور سادگی شعار تھا۔ بلالحاظ مذہب وملت

ہر کسی سے خوش دلی اور گرم جوشی سے ملنا عادت تھی۔ ہر دلعزیز شخصیت کہنا زیادہ مناسب ہے۔ خوبیوں کا چاند اچھائیوں کا سورج جواں سالی میں گہنا گیا۔ اس کی وفات پہ اس کے مخالف بھی آخرش کہہ اٹھے کہ "آج گنگوہ بیوہ ہو گئی"

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

قاضی محمد نعیم ایوبی گنگوہی

میرے برادر بزرگاں، ایک منفرد شخصیت

اللہ تعالیٰ نے سب کو دل، دماغ، آنکھیں، خیال عطا کیے۔ مگر بعض کو تحت الثریٰ تک دیکھنے والی آنکھ دی۔ دل دیا تو شیر نر، باحوصلہ، جرأت مند، زندہ تر، پر امید دریا سا گنی، دماغ دیا تو پل پل نئے افکار نئی سوچ، لاجواب نئے پلان وضع کرنے والا، زبان دی تو نرم و شیریں، ملائم متین، سنجیدہ، لطیف و پسندیدہ، خیال عطا ہوا تو شگفتہ، نازک، نفیس و بلند، شستہ آزاد، بیکراں خوشبو کی طرح۔ یہ سب اوصاف ایک جگہ جمع ہوئے تو اس مجموعہ کو قاضی محمد نعیم ایوبی کہا جانے لگا۔

میرے ماں جائے نے کسی اسکول میں نہیں پڑھا مگر اہل علم حیران تھے کہ قاضی نعیم ایوبی کتنا پڑھا ہوا ہے۔ مقدمات میں وکیل صرف بطور ڈگری ساتھ رکھا ہے ورنہ عدالتوں میں خود ہی بحثیں کی ہیں جبکہ انھوں نے قانون پڑھا نہیں ہے۔ اس بات کی صداقت و گواہی کے لیے ابھی بہت سے حضرات زندہ و موجود ہیں۔ گنگوہ میں کاشت کی زمین کئی ہزار بیگہ پر مشتمل ہے مگر ان کے حافظہ میں سب محفوظ تھی کہ کتنی زمین کس کی ہے اور کس محال میں ہے۔ علاقہ میں نیا آنے والا قانون گو تنہا ان کی مدد کے بغیر گشت نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی تو یہ گھر بیٹھ کر ہی گشت مکمل کرا دیتے تھے۔ حساب داں ایسے کہ لاکھوں کا حساب صرف زبانی طور پر کر دیتے تھے وہ بھی منٹوں میں ہماری طرح لکھ کر نہیں ـــــ اس پر طرہ یہ کہ بالکل درست جواب دراصل یہ قابلیت ان کو وہبی طور پر عطا ہوئی تھی۔ اور وہبی عطا سب سے جداگانہ ہوتی ہے۔ نہایت ملنسار، خوش اخلاق، خوش معاملہ، لیکن خوددار، بے حد غصہ ور، مگر ذرا دیر بعد نہایت نرم دل بے کینہ و بے تعصب غریب پرور، محبت کرنے والے، احکام شرح کو سنجیدگی سے لینے والے پابند صوم و صلوٰۃ شخص تھے۔ بے لوث خدمت کے

طفیل سب کے مخدوم اور اپنے خاندان کے سربراہ تھے۔ خفیہ خفیہ نہ جانے کتنوں کے بگڑے کام بنائے اور نہ جانے کتنی ڈوبتی کشتیاں ترائی ہیں۔ قاضی محمد نعیم ایوبی کا ہر اچھے اور بڑے آدمی، افسران اہلکار محکمے اور ہر شعبہ میں تعلق اور عمل دخل تھا۔ ایک اعلیٰ دماغ، قابل شخص بہت کم وقت میں ملکِ بقاہ کو چلا گیا۔ کھیت میں اشراق کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد کے چبوترے پر چڑھتے ہوئے یا پڑھ کر اترتے ہوئے بجلی کا شاک لگا اور فوراً وہیں انتقال ہو گیا۔ خدا مغفرت فرمائے۔ آمین۔

قاضی رشید مسعود (ایم. پی)

ضلع سہارنپور کی سیاست کے آسمان کا روشن ستارہ

قاضی مسعود احمد کے بڑے بھائی رشید مسعود کے تائے قاضی محمد حنیف متوفی 1942ء سے اُن سرکردہ رہنما، اعلیٰ دماغ اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کا نام گنگوہ کے بچے بچے کے دل و دماغ اور زبان پر آج بھی موجود ہے گنگوہ کے عوام و خواص کے منشاء کے مطابق مسلم لیگ کی قابل تعریف قیادت کی۔ گنگوہ کے ایک جلسہ کے دوران انگریز کلکٹر کے منھ پر بھری مجلس میں ایک زوردار طمانچہ مار دیا تھا۔ جبکہ اُس زمانے میں کلکٹر کی پوزیشن آج کے مرکزی وزیر سے بھی زیادہ ہوتی تھی اور اُس کو بہت زیادہ اختیارات حاصل ہوتے تھے، ویسے بھی اُس وقت ہندوستانیوں کو انگریز حقیر و کمتر ملکیت اور غلام سمجھتے تھے۔ اس طمانچے کی گونج دور دور تک سنی گئی تھی اور زبردست ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اس خاندان میں دلیری، بے جگری اور بے خوفی ہمیشہ سے رہی ہے، قاضی مسعود احمد چیئرمین و ایم ایل اے اگرچہ پتلے دُبلے تن و توش کے مالک تھے مگر جب ان کی بید کسی پر اٹھ جاتی تھی تو چند لمحوں میں ہی حریف کے جسم پر سینکڑوں نشانات چھوڑ جاتی تھی۔ چیئرمینی کے الیکشن کے دوران کسی بات پر کہا سنی ہونے پر چیئرمینی کے مقابل امیدوار پر ہاتھ چھوٹ گیا تو ہزاروں افراد کے درمیان اس کا مارتے مارتے بُرا حال کر دیا۔ اور یہ سب کچھ چند منٹوں میں ہی ہو گیا۔

ایسے ہی زبردست بارعب فرد رشید مسعود کے بھائی قاضی راشد مسعود چیئرمین گنگوہ تھے، ضلع میں آنے والا ہر نیا پولیس کا بڑا افسران کے مکان پر آ کر ملتا تھا۔ رشید مسعود ایم پی، سابق ہیلتھ

منسٹر حکومتِ ہنداس خانوادہ کا روشن ستارہ ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی ایس سی، ایل ایل ایم کرنے کے بعد اپنے والد قاضی مسعود کے حکم پر ملکی سیاست میں عملی طور پر شامل ہونا پڑا۔ اور ۱۹۷۷ء میں پہلی بار جنتا دل کے ٹکٹ پر ایم پی کے لیے الیکشن لڑا۔ اور کانگریس کے چودھری مولانا زاہد حسین ناظم جمیعۃ العلماء ضلع سہارنپور نیز 1947ء سے 1976ء تک مسلسل ایم ایل اے رہنے والے مجاہد آزادی، باعمل عالم، پیر طریقت قد آور شخص کو 67 فیصدی ووٹ لے کر ہرایا۔ رشید مسعود نے سہارنپور کی یہ سیٹ چار مرتبہ جیتی ہے اور ایک مرتبہ راجیہ سبھا کی رکنیت بھی حاصل کی ہے۔ رشید مسعود کا اول اول مقامی سیاست میں داخلہ تھا مگر کسی کو یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ یہ مقامی سیاست سے نکل کر آل انڈیا معیار کا لیڈر بن جائے گا۔ یہ علمی قابلیت اور ذاتی صلاحیت کا کرشمہ تھا۔ رشید مسعود 1977ء میں پارلیمنٹ میں پہنچنے والا پہلا سب سے کم عمر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ایم پی تھا۔ رشید مسعود کو امریکہ کے تمام چھوٹے بڑے اخباروں نے سماجی یگانگت، قومی یک جہتی، بلند خیالی، دانشمندانہ فکر و تدبر کے لیے اعزاز سے نواز کر توصیفی ایوارڈ سے سرفراز کیا اور یوں رشید مسعود کا نام گنگوہ کے لیے باعث مسرت بنا ہوا ہے۔

نیّر قریشی گنگوہی

نیّر قریشی اور میرا ساتھ ۱۹۵۶ء سے متواتر رہا ہے۔ اڑتالیس سالوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم دونوں میں ایک دن کے لیے بھی ناراضگی رہی ہے حالانکہ یہ ایک طویل عرصہ ہے دراصل میں اور نیّر گنگوہی متکبر ولالچی نہیں ہیں۔ میری نظر میں نیر قابلِ قدر و قابلِ احترام شخصیت ہے۔ سفر حضر میں ہم دونوں کا بہت ساتھ رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کبھی تلخی نہیں آسکی جبکہ سیاسی اعتبار سے وہ اور میں مخالف پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے، چند حضرات نیّر کو جذباتی اور مغلوب الغضب کہتے ہیں مگر لوگوں کی یہ کم نظری ہے حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اچھا انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا لیڈر اور وہ بہت اچھا شاعر بھی ہے۔ اور گنگوہ میں ہی نہیں سب جگہ مقبول و معروف ہے۔

گنگوہ میں ۱۹۴۷ء کے بعد شاعری میں جو لوگ مشہور و معروف ہوئے ہیں۔

اس فہرست میں نیر کا نام سرفہرست ہے۔ یوں خامیاں اور خوبیاں ہر کسی میں ہوتی ہیں۔ مگر خوبیوں کی زیادتی میں خامیاں پوشیدہ ہو جاتی ہیں۔ گنگوہ کی بساط شاعری پر اگر ایک طرف نسیم انور آزاد قدوسی و شمیم اکرم اعظم قدوسی چھائے ہوئے تھے تو دوسری طرف یہ کاتب الحروف اور نیر قریشی کا پلّہ بھاری رہا ہے — اور آج کل تو گنگوہ شریف کا تنہا مالک نیر قریشی ہی ہے کیونکہ آزاد قدوسی خدا کو پیارے ہو گئے اور کاتب الحروف دہلی چلا آیا ہے محترم نیر قریشی کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۱۹۸۷ء میں ''نمودِ سحر'' اور ۱۹۹۱ء میں ''خواب دریچہ'' مقبولِ عام و خاص ہو چکے ہیں اور تیسرے شعری مجموعے کی اشاعت کی تیاری ہے۔

گنگوہ شریف کے استاد شاعروں میں سے وہاں صرف اس وقت نیر قریشی ہی موجود و برقرار ہیں۔ ورنہ دوسرے یا تو اللہ کو پیارے ہو گئے یا میری طرح دوسرے شہروں میں مقیم و موجود ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ گنگوہ میں نیر کا سایۂ عاطفت تا دیر قائم و دائم رکھے۔

مولانا محمد حنیف گنگوہی

ہندوستان میں مروجہ عربی کورس کا ایشیا میں سب
سے پہلا اردو شرح لکھنے والا فرد

مولانا محمد حنیف ایک متوسط گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اور ایک ایسے محلے کے باشندہ ہیں جس کا نام نہایت محترم محلّہ سیدان غلام اولیا ہے اور اب سے ساٹھ ستر سال پہلے یہاں مخدوم و محترم صوفیا اور علماء کا ہجوم ہی رہتا تھا مگر جس زمانے میں مولانا مذکور پیدا ہوئے وہ دور بالکل تاریکی و کم علمی کا زمانہ تھا اور پورا محلّہ نور علم سے محروم تھا۔ مگر ابھی لوگوں میں علم کی طلب موجود تھی کہ بچوں کو پڑھانے کی طرف توجہ تھی۔ محلّہ میں کوئی مکتب و مدرسہ نہ ہونے کی وجہ سے یہاں سے دور چوتھے محلّہ اشرف علی مدرسہ اشرف العلوم میں آپ کو تعلیم کے لیے داخل کرایا گیا۔ یہاں آپ نے ناظرہ قرآن پاک کے بعد قرآن پاک حفظ کیا اور ابتدائی اردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی بعدہٗ دارالعلوم دیوبند میں فضیلت و مولویت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے سند فراغت حاصل کی اور ایک مقامی مدرسہ نورالاسلام محلّہ ٹانکان میں کچھ عرصہ تدریسی خدمات انجام دیں۔

مگر مدرسی میں نہ تو آپ کا دل ہی لگا اور نہ اس میں استحکام آسکا شاید اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو آپ سے ایک بڑا کام لینا مقصود تھا اس لیے آپ نے تدریسی مشغلہ میں زیادہ دلچسپی نہ لی۔ اور اپنے ذہنی خاکوں کو کاغذ پر اُتار کر ان میں رنگ بھرنے کی ٹھان لی آپ نے محسوس کیا اور بہت سے مدوسین اس بات کی ضرورت محسوس کررہے تھے کہ عربی مدارس میں جس قدر کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کی شروحات اگر ہیں بھی تو زیادہ تر عربی زبان میں یا ایکا دو کا فارسی زبان میں ہیں اس لیے ان شرحوں سے زیادہ فائدہ نہ ہوسکا۔ اس لیے یہ بہت ضروری امر تھا کہ ان کتابوں کی شرحیں اردو میں لکھی جائیں جس سے خاطر خواہ فائدہ بھی ہو اور وقت بھی زیادہ صرف نہ ہوسکے۔ مولانا کو خود بھی اس کا احساس تھا پھر بہت سے مدارس کی طرف سے شرح لکھنے کی فرمائش وتقاضہ بھی تھا۔ چنانچہ مولانا نے اس سلسلہ میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کام کی ابتداء میں مولانا کو کس قدر ذہنی، جسمانی اور علمی وفنی دقت ہوئی ہوگی شاید یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنا جانتے ہیں اوّل تو کسی کتاب کا ترجمہ اس انداز سے کرنا کہ وہ ترجمہ طبع زاد معلوم ہونے لگے۔ پھر زبان وبیان کا اس طرح لحاظ رکھنا کہ وہ زبان موجودہ زمانے کی شگفتہ، شائستہ، شستہ، بامحاورہ رواں، سلیس، متواتر ومتعدل، معتبر ومعیاری مختصر مگر جامع اور ادبی بھی ہو۔ ترجمہ کے بعد شرح میں تو اور بھی سادہ روی، دلنشینی آسانی وعام فہمی کی روش اختیار کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر تالیف کو سند مقبولیت حاصل ہوسکتی ہے۔ اور ماشاءاللہ مولانا محمد حنیف کی جملہ کتابوں میں اوّل سے ہی جملہ محاسن کا التزام رکھا گیا ہے۔ لہٰذا جیسے ہی پہلی مشروحہ کتاب منظر عام پر آئی۔ ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور اور بے انتہا مقبول ہوئی اور دوسری کتابوں کی شرحوں کی زبردست مانگ بڑھ گئی۔ اس بات سے جہاں مولانا کو قلبی مسرت ملی وہاں مزید کتابیں لکھنے کا عزم وحوصلہ اور بڑھا۔ اب ماشاءاللہ اس طرف آپ کا قلم تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے۔ کیونکہ مقبولیت کے ساتھ ساتھ لکھنے کی مہارت، کام میں آسانی کا طریقہ وطیرہ بھی تو آ گیا ہے۔ بہرکیف گنگوہ اپنے اس نونہال فرزند پر فخر کرسکتی ہے کہ اس کا یہ سپوت پوری ایشیا میں تنہا فرد ہے جس نے ہندوستان میں عربی کورس کی کتابوں کی سب سے پہلے اردو میں شرحیں لکھی ہیں۔

حکیم محمود اجمیری

خانوادۂ قدوس کے چشم و چراغ صادقی ــــ شہزادہ، ماہر نبض حکیم و ڈاکٹر، مقبول خاص و عام، پیر و مرشد، منظور نظر حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ پیکر معرفت و حقیقت، واقف راز شریعت و طریقت حضرت حکیم محمود احمد اجمیری آج دنیائے سلوک کے دل کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں۔ یہ قال اللہ، قال الرسول، حق ہو اللہ کی صداؤں، ذکر و اذکار کی محفلوں کے امیر و داعی ہیں۔ ہمہ وقت رشد و ہدایت کی بزم آرائی ہے۔

گنگوہ شریف نواحِ شہر قطب ہریانہ، پنجاب، نظام الدین میں اجمیری مطب، شارجہ اور دبئی میں قدوسی و رشیدی دریا ایک ہو کر بہہ رہے ہیں اور مخلوق خدا فیضیاب ہو رہی ہے۔ ماشاء اللہ رجوع عام کا یہ عالم ہے کہ روحانی مجلسیں گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ، شہر شہر، جگہ بہ جگہ رونق پذیر ہو رہی ہیں۔ اور بیعت و ارشاد، دینی اتفاق و اتحاد رو بہ ترقی ہے۔ مجاہدات، ریاضات اور عبادات کے جلوس عروج پر ہیں۔ اور یہ سب نوازش حضرت مفتی صاحب کے تصرفاتی توجہ کا نتیجہ ہے۔ کہ ذاتِ محمود اجمیری تفسیر ہدایت و شریعت بنی ہوئی ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

شاہ محی الدین علی قدوسیؒ

ایک نوجوان مرشد

ایک ناچیز قطرہ پھیل کر پہلے دریا پھر بیکراں سمندر کیسے بن جاتا ہے یہ عجوبہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک بے وقعت، معمولی تن و توش اور بے نام ہیئت بچے کا چند ہی سالوں میں ہزارہا مخلوق کا قدآور مرشد بن جانا عجیب سا لگتا ہے۔ مگر ہے بالکل حقیقت ـــــ یہ چند مختصر لمحوں کی طویل تر داستان ہے۔ میرے قلم کی زبان پر محی الدین علی قدوسی کا نام ہے بظاہر یہ ایک شخص کا نام ہے ورنہ اصل یہ ہے کہ ایک تاریخ، ایک سرگزشت ایک دور کے مطالعہ کا نام ہے میرے تصور کے طول و عرض میں محی الدین کے بچپن اور جوانی کی بساط بچھی

ہوئی ہے۔محی الدین شاہ امتیاز جہاں کا ہونہار فرزند ہے۔جس کے سر میں اپنی خاندانی عظمت وشوکت کو واپس حاصل کرنے کا سودا سمایا ہوا ہے شاہ امتیاز جہاں اسم بامسمّٰی تھے، وہ سب میں ہر طور پر ایک امتیازی شان کے مالک تھے علم کے دریا، سادگی کے سمندر، درویشانہ طرز وطریقہ۔ ہر حال میں صابر وشاکر۔ مقدمات کی بھرمار، خاندانی وسیاسی مخالفتیں، خاتمہ زمینداری کی آفت۔ چنانچہ گھر غربت کا مرکز بن کر رہ گیا۔مگر اخراجات بدستور۔اس پر بھی رسومات عرس کا پورا ہونا پورے اہتمام کے ساتھ اس لیے تمام جمع شدہ اثاثہ اور گھر کا تمام اسباب وسامان جاتا رہا۔شاہان لودھی ومغلیہ کا تعمیر کردہ محل نما اور قلعہ کے طرز کا مکان کھنڈر بننے کی دہلیز پر آ گیا۔اور شاہ امتیاز جہاں بچوں کو بے یارومددگار چھوڑ کر وفات پا گئے۔ میں نے محی الدین کو کم سنی سے جوانی کی طرف آتے آتے کئی قسم کی تجارتیں اور الگ الگ نوعیّت کے کاروبار کرتے دیکھا ہے۔اُس کے ماہ وسال قیام میں کم سفر میں زیادہ تر بسر ہوتے تھے۔ترقی کی منزلیں طے کرنے میں پیدل ہی نہیں، ننگے پاؤں بھی چلنا پڑا ہے اس کے کچی عمر کے سر میں پختہ وتنومند دماغ موجود تھا۔ وہ ہمہ دم سنجیدہ وپختہ شعور کے ساتھ تازہ دم رہتا تھا۔ اس کی لغت میں لاپرواہی، کسل مندی اور اضمحلال کو بالکل دخل نہ تھا۔ وہ ہر پل عظمت رفتہ کو واپس لانے کی سعی میں مصروف رہتا تھا اس کا دماغ نئے نئے تانے بانے بُننے میں لگا رہتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے خاندانی مکان کو زیادہ دنوں تک کھنڈر کی شکل میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ بزرگوں کی وراثت کو پھر سے حاصل کرنے کی لگن اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ کیونکہ اس نے اسی کو اپنی زندگی کا منشا بنالیا تھا۔اور اس کی بازیافتگی کا اپنے ذہن میں خاکہ تیار کرلیا تھا۔اس کے شعار، احوال، آثار، انداز اور اطوار سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی خاص الخاص منصوبے کے تحت زندگی کے نشیب وفراز طے کرنے میں لگا ہوا ہے۔ دوستوں سے اہل خانہ سے عرس میں سجادگان سے بلکہ ہر فرد وبشر سے وہ ایک مخصوص طرز فکر کے ساتھ پیش آتا تھا اس نے اپنے اصل مدعا کے تحت ہر حال میں ہر پل ہر ایک سے وہ طریقہ روا رکھا جو اس کی منزل کی طرف جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے سلسلۂ تعلیم منقطع کر چکا تھا۔شریعت، طریقت، تصوف، سیاست پر اس کی بڑی گہری نظر تھی حافظہ نہایت قوی اور یادداشت بہت تیز تھی، قدوسی بزرگوں کے حالات کا

زبردست حافظ تھا۔ شکیل وجمیل وجیہہ نوجوان تھا، گورے چٹے چہرہ پر شاہانہ رعب ووقار تھا۔ شعلہ بیان مقرر وخطیب تھا، ملنسار اور یار غار آدمی تھا۔ اس کا رہنا سہنا، کھانا پینا، طرز وطریقہ پوشاک وغیرہ جداگانہ وشاہانہ تھا۔ سید شاہ ناصر حسین سجادہ نشین درگاہ صابری دریا گنج کے مرید وخلیفہ تھے۔ محنتی وذہین تھے، معراج ترقی کے لیے زبردست جدوجہد سے کام لیا آخر اللہ تعالیٰ نے ظاہری، باطنی، ذہنی قلبی جسمانی، روحانی تمنا سے زیادہ فارغ البالی مرحمت فرمائی۔ عظمتِ قطب عالم سابقہ کی طرح واقع ہوئی اور جس طرح حضرت قطب عالم صابری سلسلہ کے مجدد کہلائے گئے بالکل اسی طرح محی الدین بھی قدوسی سلسلہ کے مجدد قرار پائے کیونکہ اس کے دور میں قدوسی سلسلہ کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ ہماچل پردیش، پنجاب، ہریانہ اور یوپی میں محی الدین علی کے لاکھوں مریدین وخلفا موجود ہیں خاص طور سے ریاست رام پور واطراف رام پور اور مراد آباد قابل ذکر ہیں۔ وجاہت وشباہت، فراست وقیادت، قدوسیت، خاندانی نجابت وشرافت کی بنا پر شہزادۂ قطب عالم پکارا جانا بجا ہے۔ مگر جوان العمری میں ہی انتقال ہوا۔ گویا جس کام ومقصد کی وجہ سے اللہ نے محی میاں کو پیدا کیا تھا تو جب وہ پورا ہو گیا تو اپنے جوار رحمت میں واپس بلا لیا ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

صوفی ظہیر اختر

صحافت، ادب وشعر، تعلیم، تنقید، تبصرہ، ترمیم وتنسیخ، تحریک وتنظیم کے بروقت استعمال میں ظہیر اختر کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ تعلیم سے دلی لگاؤ ہے یہی وجہ ہے کہ دن میں ایچ آر انٹر کالج گنگوہ میں تعلیمی خدمت انجام دی جاتی ہے اور رات میں اپنی بیٹھک میں بچوں و بڑوں کو بلا معاوضہ پڑھایا جاتا ہے۔ سوشل ورکری گویا گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ سیاست اس کے گھر کی لونڈی ہے۔ کسی پر تنقید وتبصرہ کرنے میں زبردست مہارت حاصل ہے۔ کسی کام کی تحریک دلا کر اس کی تنظیم کرنا اور بروئے کار لانا، بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ظہیر اختر کو صحافت میں بڑا درک ہے۔ کئی ہفتہ وار اور ماہنامے جاری کر کے داد وتحسین سے خود کو

متصف کیا ہے۔ ادب وشعر جیسے ظہیر کی روح کی آواز ہے۔ جب گھر اور نشست گاہ میں مشاعرے منعقد ہوتے ہیں تو پورے شہر ہی میں نہیں نزدیک ودور بھی شہرت ہو جاتی ہے۔

ظہیر اختر خوش اخلاق، مخلص وانسانیت نواز انسان ہے۔ اس محفل میں عدو، وعزیز یکساں ہیں۔ یہاں عام وخواص سب کی پذیرائی ہے۔ ہمہ دم قوم وملت اور ملک کی فلاح وبہبودی میں مصروفیت رہتی ہے اور پیشانی پر شکن تک نہیں آتی کیونکہ یہاں ابھی بھی شرافت باقی ہے۔

ظہیر کے مشاعروں میں سہارنپور، دیوبند، میرٹھ، مرادآباد، دہلی اور قرب وجوار کے معقول شعراء شرکت کو باعث فخر تصور کرتے ہیں کیونکہ ان مشاعروں کا انداز، شان وشوکت، رکھ رکھاؤ، قدر ومنزلت بالکل سلف کے گزرے زمانوں کی یادگار ثابت ہوتی ہے۔

ظہیر اختر خود ایک انجمن، ایک مدرسہ، ایک حکایتِ لذیذ، داستانِ دلکش اور نمونۂ سلف کی باقی ماندہ رمق ہے جو غنیمت ہے ع

اللہ کرے اوصاف حمیدہ ہوں اور زیادہ

محمد یونس کوثر ایڈوکیٹ

جواوروں کے لیے آئینہ بن گیا

یونس کوثر پیکر عزم وثبات، خاموش طبع، حساس دل، سنجیدہ خو، باحوصلہ، فعّال متوازن فطرت اور باعمل فرد کا نام ہے۔ جس نے بے یارومددگار اپنے جینے کی راہ خود متعین کی ہے اور دوسروں کے لیے ایک مثالی شخصیت بن گیا ہے۔ اس کے علم وفضل سے میں بالکل متاثر نہیں ہوں قانون داں ہونا علم وکمال میں نام پیدا کرنا۔ جہان زندگی میں تو ایسے بے شمار افراد ہیں جبکہ علم حاصل کرنا انسان کا فرض اوّلین بھی ہے کہ علم ذریعہ ہے ترقی کا بزرگی کا اعلیٰ مدارج کا قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ جس ماحول میں معاش کے مقابلہ میں علم وکمال کو دوسرے نمبر پر رکھا جاتا ہو۔ جہاں صرف خط وکتابت اور نماز وروزہ وغیرہ کی معلومات کی تعلیم کو کافی سمجھا جاتا ہو جس طبقہ میں تجارت وحرفت اور صنعت کے ذریعہ معاش

پیدا کرنے کا عام وطیرہ بن گیا ہو اور معاشی استواری کو ہی زندگی کا اصل مقصد سمجھ لیا گیا ہو۔ ایسے ناسازگار ماحول میں ایک شادی شدہ شخص جو عمر کی بیس پچیس منزلیں چل چکا ہو اور معاشی بہتری کے لیے کسی پیشہ سے بھی منسلک ہو ایسے شخص کی سرشت میں وہ کون سی چنگاری تھی جو اندر ہی اندر بھڑک کر پہلے تیز آگ بنی اور پھر ایک شعلۂ جوالہ میں تبدیل ہو گئی جس نے محمد یونس کو پہلے کوثر پھر ایڈوکیٹ بنا دیا۔

دراصل جب جبر وتشدد، ظلم وجور کی زیادتی ہو جاتی ہے تو قدرتاً اور فطرتاً فضائیں منقلب ہو جاتی ہیں اور پھر انقلاب سے بچنا محال ہو جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب جب ظلم بڑھا ہے انقلاب آیا ہے۔ گویا تخریب سے تعمیر ہوتی ہے، تنقید سے ترقی ہوتی ہے، محمد یونس کوثر اور ان کے خاندان پر جب جابرانِ وقت کی ناانصافیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو یونس کوثر کا دل تلملا کر رہ گیا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ علم وکمال اور قانوندانی ہی مقصد حیات ہے چنانچہ موجودہ کام کاج کو چھوڑ کر تعلیمی دوڑ میں شامل ہو کر ڈگریوں کی لگن لگ گئی اول جامعہ اردو کے جملہ امتحانات دیے پھر بھوپال میں مقیم رہ کر بی اے، ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ سہارنپور میں آ کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا جو تادم تحریر جاری ہے۔ ذرا خیال کیجیے ایل ایل بی کی ڈگری لینے تک ایسے شخص کو کس قدر جانفشانی کرنی پڑی ہو گی جو انگریزی کا ایک حرف تک نہ جانتا ہو جبکہ وکالت کی تمام تعلیم معیاری انگریزی میں ہی ہے ـــــ اور ضخیم ضخیم قانونی کتابیں بھی نہایت ادق، مشکل، سخت زبان میں ہیں۔ وکالت میں یہی نہیں کہ پڑھ پڑھا کر وکیل بن گئے بلکہ کسی اہل زبان کی طرح پوری روانی کے ساتھ بحثیں کرنا، مقابل کو اپنی زباندانی کی قابلیت سے زیر کرنا بھی ضروری ہے اور یہی وکالت کا اصل گُر اور کامیابی کی دلیل ہے۔ اگر غور کیا جائے تو کوئی بھی کام مشکل نہیں اگر انسان پختہ ارادہ کر کے حوصلہ اور عمل کو رہبر بنا لے۔ کوثر نے اپنے عمل واحساس ارادے کی پختگی، جسمانی ودماغی، جانفشانی اور بلند حوصلگی سے ثابت کر دیا ہے کہ شیخ سعدی شیرازیؒ نے ہی نہیں چالیس سال کی عمر میں علم حاصل کر کے دنیا میں نام پیدا کیا بلکہ کوثر جیسے اور بھی کئی علم پرور علم آشنا، علم کے جویا موجود ہیں جو اپنے دور کے نامور حضرات میں شمار ہوتے ہیں۔

عمران عظیم

جو بیک وقت ادیب، شاعر، نقاد اور قانون داں بھی ہے

گنگوہ شریف ایسا قصبہ ہے جس کی زرخیز زمین سے گلہائے رنگارنگ پیدا ہوئے ہیں اور جن کی خوشبو نے ہندوستان کو ہی نہیں بلکہ بیرونِ ہند کو بھی اپنی مہک سے مہکا دیا ہے یہاں کے باشندے قریب و دور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی دانشوری و بصیرت کے جلوے دکھا رہے ہیں۔ ہر آدمی اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا ہے اور یہ انفرادی شناخت ہی اُس کو دوسروں سے ممتاز بناتی ہے۔ ایسا ہی ایک نوجوان عمران عظیم بھی ہے۔ جو بیک وقت شاعر، ادیب، نقاد اور قانون داں ہے۔ جس نے اپنے ہم عصر جدید و قدیم لوگوں میں اپنا ایک معتبر و نمایاں مقام بنایا ہے۔ گنگوہ کی نمائندہ اور قابل قدر بہت سی شخصیتیں ہیں اور بہت سی ہو سکتی ہیں۔ مگر عمران عظیم کی شخصیت میں ''عجائب روزگار تخلیقی شناخت'' کا ادراک و احساس ملتا ہے۔ عمران عظیم وہ نام ہے جس نے بہت سے فنکاروں سے بہت پہلے بلکہ اپنے قد سے بہت بڑے مقام کو پالیا ہے اگر یہ کہا جائے کہ اب تک گنگوہ کے کسی قدیم وجدید اہل فن کو وہ امتیاز حاصل نہیں ہو سکا جو عمران نے کم عمری میں حاصل کرلیا ہے اور عمران بڑی تیز روی کے ساتھ انفرادیت کی اعلیٰ منزل کی طرف رواں ہے۔ اس کے اشعار جدید لب ولہجہ کے ساتھ ہمیں اچھے لگتے ہیں اور اس مقام پر اس کا استقرار آج کی بے اقدار اور ناہموار زندگی کا محاصرہ کرتا نظر آتا ہے۔ اسی لیے مجھے تحریک ہوئی کہ عمران عظیم کے بارہ میں چند سطور تحریر کروں۔

دراصل اپنے مخصوص اندازِ فکر، اچھوتے لب ولہجے، عجب حسن ادا، نئے طرز و اسلوب میں تلخ حقائق کی بے لوث ترجمانی روایت وجدت کے حسین امتزاج کے ساتھ کم عمری کے باوجود اشعار میں خارجی تجربات وحوادث کی فنکارانہ مصوری۔ اعلیٰ اقدار کی زوال پذیری۔۔۔ ثقافت وشرافت کی پائمالی، حال کی اقتصادی ومعاشرتی تناظر میں انسانی محرومیوں، تلخیوں مجبوریوں اور ناکامیوں کا دیانت دارانہ بیان و اظہار عمران عظیم کو دوسروں سے ممتاز معزز ین

کے زمرہ میں شامل کر کے نئی حسیت کی نئی جہتوں کے سمندروں کا ہوشیار و ماہر غواص قرار دیتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ یہ وہ ادیب ہے جس کا ہر جملہ گہرائی و گیرائی کا سچا عکاس ہوتا ہے فی الحال گنگوہ شریف کا یہ تنہا شخص ہے جس کی شاعری عالمگیر سچائیوں کا معتبر ادراک واظہار ہے یہ وہ ادیب ہے جس کے فن پارے نیک جذبوں میں ڈھل کر انسانی روح پر اثر انداز ہور ہے ہیں۔ یہ وہ نقاد ہے جو موجودات کی ہر جنبش پر نئے زاویے سے نظر ڈال کر الفاظ کو نئی رمزیت کا لباس پہنا دیتا ہے اور فکر نو کی ایماندارانہ بالیدگی کے ساتھ پیش کرتا ہے جس سے انگنت مطالب سامنے آتے ہیں—— عمران عظیم گنگوہ کی سرزمین سے سب کے دلوں کی آوازیں بن کر بلند ہو رہا ہے۔ اپنے علمی وادبی قد کی بلندی کے ساتھ ساتھ گنگوہ کے قد کو مزید نئی اونچائیاں عطا کر رہا ہے۔ اب تک دو شعری مجموعے اور ایک کتاب تنقید پر ''حرف زار'' شائع ہو چکے ہیں۔ دو شعری مجموعے ''کمند حرف''، ''رنگ صدا''۔

شوبھت کمار اور ڈاکٹر شیکھر کمار

اگر انسان کچھ قابلِ قدر کام کرنے کی ٹھان لیتا ہے تو وہ یقیناً اس کام کو پورا کر لیتا ہے۔ مگر شرط ہے ہمت، حوصلہ، عمل، اور پکے ارادے کی کیونکہ احساس، شعور اور دماغی قوتیں تبھی کارآمد ہوتی ہیں جب آدمی کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ آدمی یہ کام انجام دے سکتا ہے—— ہمالیہ جیسی عظمت لیے اپنی جگہ چٹان کی طرح ثابت قدم گنگوہ کا ایک کم عمر سپوت شوبھت کمار بھی ہے جو اپنے والد بابو وجیندر کمار کی طرح جذبۂ ایثار، قربانی اور علم و عمل کا شہزادہ ہے۔ شیکھر کمار اپنے بھائی کا زبردست ہم نوا ہے یہ دونوں نوجوان اپنی ذات میں کامل و اکمل انسان اور عصری علوم میں ماہر و نامور ہیں۔ دونوں نے والد کی زندگی میں ہی شہر میرٹھ کو اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کا مرکز بنا لیا تھا۔ ایک نے کامیابی کے ساتھ خدمت خلق کا پیشہ ڈاکٹری کو اپنایا اور دوسرے نے ایک اسکول بالکل منفرد انداز کا قائم کر کے اپنا نصب العین تعلیم کو بنایا اور اپنے ذہنی، قلبی اصل مقصد کے لیے وہاں رہ کر راہ ہموار کی۔ دونوں بچے گنگوہ کو ''علمی سوغات'' دینے کی آرزو لیے ہوئے اپنے دلوں میں تھے اس
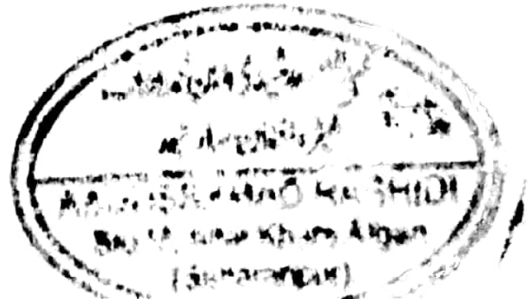
لیے اپنی تمام جائداد صحرائی اور سکنائی زمین تعلیم کے لیے وقف کردی۔ صوبائی اور مرکزی سرکاروں سے بدقتِ تمام گنگوہ کے لیے دو کالج شوبھت انجینئرنگ کالج اور شوبھت ہاسپٹل ومیڈیکل کالج منظور کراکران کی عمارتیں تیار کرائیں اور تعلیم کی ابتدا کی۔ میڈیکل کالج کی عمارت ابھی زیرِ تعمیر ہے البتہ انجینئر کالج اور ہاسپٹل جاری ہو چکے ہیں۔

گنگوہ میں پہلے بھی اور آج بھی امیر لوگ موجود ہیں مگر کسی نے گنگوہ میں سب کے فائدے کے لیے کوئی کام انجام نہیں دیا۔ کیونکہ فلاح و بہبودی ترقی کے کاموں میں ذہن وشعور، وقت، مال، دولت، جسمانی ودماغی قوتیں، سفر حضر کی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ یہ سب پریشانیاں وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو ہمدردِ انسانیت، محبت اور مساوات کے حامی ہوتے ہیں۔ ان دونوں بچوں کے اہل گنگوہ ممنون ومشکور ہیں۔

حافظ سلیم احمد گنگوہی مقیم حال خریجی دہلی

کہاوت ہے کہ ''لڑکا اپنے بوڑھے باپ کی لاٹھی ہوتا ہے'' مگر حافظ سلیم احمد الحاج محمد اختر کی جوانی میں سہارا بنے۔ ویسے بھی بڑا لڑکا بھائی جیسا مانا گیا ہے۔ کیونکہ وہ باپ کے ساتھ مل کر اس کے بہت سارے کاموں میں مددگار بن جاتا ہے۔ حافظ صاحب نے اپنی انتھک جدوجہد، اعلیٰ کارکردگی، عزم وہمت، استقلال اور ہمہ وقت ترقی و بلندی کے زینے کی طرف بے خوف وخطر روانگی سے ثابت کر دکھایا ہے کہ جوانی سے ذرا پہلے عبوری وقفے میں نوجوان باپ کی مدد کس طرح کی جاتی ہے۔ اور ترقی کی طرف کس کس طرح دوڑا جاتا ہے۔ جدوجہد کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ وطن عزیز سے تو بے یارومددگار آئے تھے۔ دیارِ غیر میں اپنا مقام خود بنانا تھا۔ روشن مستقبل کے لیے ضروری تھا کہ آگے بڑھنے کے لیے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کیا جائے اور پھر ع—

چلے آؤ جہاں تک راستہ معلوم ہوتا ہے

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے فراست وبصیرت، یقین وشعور، جواں ولولے، ہمت مرداں، دانش یگانہ عطا فرمائی ہے۔ وہ لوگ ابتدائی خراب ایام کو یوم راحت سے

بدل دیتے ہیں۔ کیونکہ رب العالمین ان کی مدد کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ان اللّٰہ لایغیر مابقوم الخ'' جولوگ اپنی حالت خود نہیں سدھارنا چاہتے ہم بھی ان کی حالت نہیں سنوارنا چاہتے۔'' جو دل تجربات کی آگ میں تپ کر نکلتے ہیں کندن بن جاتے ہیں۔ حافظ سلیم احمد خالص سونا ہیں۔ اپنے تمام بھائیوں کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں اور حاجی اختر کا لامحدود کاروبار آپ کے ہی گرد گھومتا ہے۔ اپنے ہم عصروں، ہم سایوں اور قصبے کے لوگوں سے خوش اخلاقی سے ملتے ہیں۔ اور ذرہ بھر بھی امارت کی بو محسوس نہیں ہونے دیتے۔ ماشاء اللہ بحیثیت تاجر اور انسان کامل کامیاب وکامران ہیں۔ بے پناہ کاروباری مصروفیت کے باوجود رمضان المبارک میں قرآن پاک تراویح میں سنانا نہیں بھولتے۔ یہ خزانہ ساری دنیا کے خزانوں سے بڑھ کر آپ کے سینے کو منور رکھتا ہے۔

روحِ تاریخ

۱۴۲۵ھ

تاریخ— ایک خشک ادق اور منتشر موضوع ہے لیکن مورخ— باحوصلہ، مستقل مزاج، ہمہ لحہ، جوئندہ، لیکن یہ ایک آئینہ ہے جس میں ملکوں، قوموں، ملتوں، قدیم وجدید زمانوں کی کارکردگی کی شکل دیکھی جاسکتی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے مستقبل کے راستے کا واضح اشارہ بھی ہوتا ہے۔ یہ اپنے دامن میں نعمتیں، مصیبتیں، مسرتیں، ترقی وتنزلی کا تذکرہ بھی لیے ہوتی ہے گویا تاریخ، ماضی، حال اور مستقبل کا معتبر اظہار بھی ہے مگر دراصل تخلیق کا واحد سبب ذات کی پہچان ہے۔ ''روحِ تاریخ''، یعنی ''ذاتِ تاریخ'' کیا ہے؟ یہ ہے کہ جس موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے اس کی جزوی وکلّی معلومات کا ذخیرہ ذاتِ تاریخ ہے اور معلومات کے نایاب موتی گہرے سمندروں کی نامعلوم تہوں کے اندھیروں سے تلاش کر کے منظرِ عام پر لانے کا نام تاریخ نویسی ہے۔

قاضی محمد نسیم انورایوبی نے گنگوہ شریف کے حالات وواقعات گمنامی کے بیکراں سمندروں کی تاریک گہرائیوں سے معلومات کے تابناک لعل وگوہر، روایت کی پاسداری، حسّی وابستگی، درایت کی صداقت وآشنائی کے حسین امتزاج کے ساتھ ایک ماہر غواص کی طرح برآمد کر کے ''شہر بزرگ گنگوہ شریف'' کے نام سے قارئین کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ جب کہ گنگوہ شریف کے متعلق اس سے پہلے جملہ حقائق پردۂ خفا میں تھے— انورایوبی قابلِ مبارک باد ہیں کہ ایک معقول ومعتبر دستاویز فراہم کی ہے۔

مسز، بی، داس

لکچرر دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی

۱۵رمئی ۲۰۰۴ء